Regd. L. No.7243 Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون 1977

"نظامِ مصطفیٰ" کیا ہے؟

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام – ۲۵ بی، گلبرگ – لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون نمبر	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ۱۸/- روپے غیر ممالک ۳ پونڈ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	۱½ ڈیڑھ روپیہ
جلد ۳۰	جون ۱۹۷۷ء	شمارہ ۶

فہرست

۱- لمعات ——————— ۲

۲- "نظامِ مصطفیٰ" (صلے اللہ علیہ وسلم) ——— (پرویز صاحب) ——— ۹

۳- جرم اور سزا ——— (پرویز صاحب) ——— ۳۳

۴- قطعِ ید اور دوسرے شرعی حدود ——— (ابوالاعلیٰ مودودی صاحب) ——— ۴۰

۵- تعویذ گنڈوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں! ———
(رفیع اللہ شہاب صاحب) ——— ۴۴

۶- بزمِ مذاکرہ - (قسط چہارم) - (منعقدہ کنونشن ۱۹۷۶ء) ——— ۴۷

۷- جرمِ زنا کی سزا ——— (رفیع اللہ شہاب صاحب) ——— ۵۷

ایڈیٹر محمد خلیل - پبلشر سراج الحق - مقام اشاعت ۲۵- بی گلبرگ ۲ لاہور - پرنٹر شیخ نیاز احمد - مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں!

اس بدنصیب ملک میں ہنگامہ آرائیوں کے شعلے بھڑکتے گئے اور (ان سطور کی تسوید تک) بھڑکائے چلے جا رہے ہیں اور طلوعِ اسلام، اپنی روش کے خلاف، ٹک ٹک دیدم، دم نکشیدم کے بمثل، لب دوز (بظاہر) محوِ تماشا ہے ـــــ لیکن گذر رہی ہے جو دل پر کسی کو کیا معلوم؟ اس کی اس تعجب انگیز، غیر متوقع خاموشی پر، احباب کی طرف سے استفسارات، تقاضے، مطالبے، مشورے، شکوے، بلکہ شکایت ہائے رنگین، اور بعض گوشوں کی طرف سے طنز و طعن کے تیر و نشتر تک موصول ہو رہے ہیں اور یہ، ان سب کے باوجود، لب بند ہے۔ جہاں تک ملک میں برپا ہونے والے انتشار اور خلفشار سے اثر پذیر ہونے کا تعلق ہے، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ بہت کم قلوب ہوں گے جو اِس جیسے وقفِ کرب و اضطراب ہوں۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ طلوعِ اسلام نے مطالبۂ پاکستان کی تحریک میں اپنی بساط سے بھی بڑھ کر حصہ لیا تو اس کے پیشِ نظر مقصد صرف انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنا اور اپنی آزاد مملکت کا قیام نہیں تھا۔ اس کا نصب العین ایک ایسے خطۂ زمین کا حصول تھا جہاں قرآنی نظام قائم کیا جا سکے تاکہ اسلام ایک بار پھر اپنے ماضیٔ بعید کی طرح زندہ و تابندہ ہو سکے۔ یہ مقصد طلوعِ اسلام کا مایۂ حیات اور تقاضائے ایمان تھا۔ آپ ۱۹۳۸ء سے لے کر آج تک کے اس کے فائل اٹھا کر دیکھئے، اس کا کوئی فائل، اس فائل کا کوئی پرچہ، اور اس پرچہ کا کوئی ورق ایسا نہ ہوگا جو اِس مقصدِ حیات اور تقاضائے ایمان کا شاہد نہ ہو۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس کے نزدیک اس خطۂ زمین کے تحفظ، بقا اور استحکام کی اہمیت کس قدر ہے۔ اگر (خدانخواستہ) اس خطۂ زمین کو کچھ گزند پہنچ گیا تو، اوروں کی تو شاید دنیا ہی اُجڑے گی، طلوعِ اسلام کی (محاورہ کے مطابق) دین و دنیا دونوں ویران ہو جائیں گے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جو کچھ ملک میں ہو رہا ہے اس سے اس کا قلبِ حزیں کس قیامت کی گذرگاہ بن رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود:

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں۔ ورنہ کیا بات کر نہیں آتی؟

اور وہ بات جس کی وجہ سے اِسے چپ لگ رہی ہے، کوئی سرِّ سربستہ نہیں۔ کوئی ایسا راز نہیں جسے کھلے بندوں کہا نہ جا سکے۔ بات بالکل صاف اور واضح ہے۔

طلوعِ اسلام عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتا۔ نہ ہی اس کا تعلق ملک کی کسی سیاسی پارٹی سے ہے۔ اس کی دعوت فکری ہے جو کاروانِ ملّت کو، زندگی کے ہر دوراہے پر بتاتی ہے کہ اس کے لئے سلامتی کی راہ کونسی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا مشورہ اس وقت دیا جانا، اور ایسی نصیحت اسی حالت میں کی جانی مفید ہو سکتی ہے جب دوسرا، سننے کے (MOOD) میں، اور سمجھنے سوچنے کے لئے آمادہ ہو۔ اِس وقت ملک کی حالت یہ ہے کہ کچھ لوگ اپنی مفاد پرستیوں کے نشہ میں بدمست ہیں اور کچھ، مشتعل..... جذبات کے جنون میں پاگل ہو رہے ہیں۔ آپ سوچئے کہ جو شخص "شراب کے نشہ میں دُھت" یا شدتِ جنون میں "ہلّہ مچا رہا ہو" اُسے ایسی حالت میں کوئی نصیحت بھی کارگر ہو سکتی ہے؟ ایسی حالت میں ہر نصیحت بیکار اور ہر مشورہ عبث ہوتا ہے ——— بے کار اور عبث ہی نہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ کچھ اور! علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

مردِ ناداں پر تو ایسا کلام فقط بے اثر ہوتا ہے، شرابی اور پاگل کے متعلق آپ کہہ نہیں سکتے کہ ایسے نصائح پر اس کا ردِّ عمل کیا ہو۔ لہٰذا ایسے حالات میں خاموشی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس قسم کی خاموشی مغزِ استخواں تک کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ بقول غالبؔ ؎

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط شعلۂ خس میں جیسے، خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

طلوعِ اسلام انتظار کر رہا ہے کہ مدہوشوں کا نشہ اُتر جائے اور موسمِ جنون کی شدت میں کچھ کمی واقع ہو جائے تو یہ ان سے کہہ سکے کہ ذرا دیکھو کہ تم نے جو گھر اجاڑا ہے، خود تمہارا اپنا گھر ہی تو نہیں؟ اُس وقت اگر انہیں اپنے کئے پر افسوس ہوا تو یہ اس پر غور کر سکیں گے کہ آئندہ اس قسم کی تباہی و بربادی نہ ہونے پائے۔

اِس وقت البتہ ایک اور طبقہ ایسا ہے جسے کچھ بتانا اور سمجھانا مفید ہو سکتا ہے، اور آئندہ سطور میں وہی طبقہ ہمارا مخاطب ہے۔ آپ ہم سے متفق ہوں گے کہ ملک کی ساری آبادی اس جنون کا شکار نہیں ہو رہی۔ اس نشہ میں مدہوش یا اس جنون میں مبتلا تو ملک کی چھ سات کروڑ آبادی کا اقلِ قلیل حصہ ہے۔ شاید فی ہزار ایک بھی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ ملک کی بقایا، اس قدر کثیر آبادی کیا سوچ رہی، اور کیا کر رہی ہے؟ یہ نہ کچھ سوچ رہی ہے، نہ کچھ کر رہی ——— اس پر مایوسی طاری ہے۔ آپ اس طبقہ کے جس فرد سے بھی ملیں گے اس کے لب پر پہلا سوال یہ ہوگا کہ "اب کیا ہوگا؟"..... "اس ملک کا کیا بنے گا؟" مشکلات ہزار پیش آئیں اگر ان کا حل آپ کے سامنے ہے تو آپ پر کبھی مایوسی طاری نہیں ہوگی۔ مایوسی اس وقت طاری ہوگی جب کسی مشکل کا حل سمجھ میں نہ آئے۔ منزل

کتنی ہی دور کیوں نہ ہو، اور آپ کتنے تھکے ہوئے بھی کیوں نہ ہوں، اگر اس تک پہنچنے کا راستہ آپ کے سامنے ہے، تو آپ کچھ وقت تک سستانے کے لئے بیٹھ جائیں تو اور بات ہے، آپ مایوس نہیں ہوں گے۔ آپ مایوس اس وقت ہوں گے جب آپ کو کوئی راستہ نظر نہ آئے۔ قوم کے اس کثیر حصّہ کی، جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اس وقت یہی حالت ہے۔ یہ جو ہر شخص سرتاپا سوال ہے کہ "اب کیا ہوگا؟" تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس تباہی سے نکلنے کا کوئی راستہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم انہیں اس وقت یہی بتانا چاہتے ہیں کہ یہ تمام راستے بند کیوں ہوگئے جس کی وجہ سے آپ پہ مایوسی چھا گئی۔ یہ بات ہم صرف انہی کو نہیں بتانا چاہتے ــــ ہمارا مقصد، اس سے وسیع تر ہے۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ اگر موجودہ کشمکش میں یہ خطۂ زمین محفوظ رہ گیا ــــ خدا اسے ابدالآباد تک محفوظ رکھے ــــ اور یہاں کوئی ایسا طبقہ پیدا ہوگیا جو نہ خود غرض، مفاد پرست ہو، اور نہ ہی ذرا سی بات پہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے، تو وہ ہماری ان معروضات پر غور کرکے دیکھ سکے کہ اس تباہی کے اسباب کیا تھے، اور ایسا راستہ اختیار کرے جس سے ان اسباب کا اعادہ نہ ہو۔

کہنے کو تو اس تباہی کے متعدد اور گوناگوں اسباب ہیں، لیکن وہ مایوسی جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اس کا بنیادی سبب ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے مغرب کا وہ جمہوری نظام جسے ہم آیۂ رحمت سمجھ کر سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ یہ ساری تباہیاں اسی کی لائی ہوئی، اور یہ ساری مایوسیاں اسی کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ مغربی جمہوریت کا قدمِ اوّل یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم کو مختلف پارٹیوں میں بانٹ دیتی ہے جن کا مفاد الگ الگ، اور ایک دوسرے کے متخالف ہوتا ہے اس لئے ان میں تصادمِ مفاد فطری ہوتا ہے۔ ہر پارٹی ایک دوسرے کی رقیب اور حریف ہوتی ہے۔ جمہوری دستور کی رُو سے ان تمام پارٹیوں کو ایک دوسرے کے خلاف نفرت پھیلانے کی اجازت بھی ہوتی ہے، اور جو پارٹی اقتدار حاصل کرلے، اس سے اقتدار چھین لینے کا آئینی حق بھی۔

مغرب کے منہاجِ قومیت (نیشنلزم) نے عالمگیر انسانیت کو مختلف ٹکڑوں (قوموں) میں تقسیم کر دیا جن کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا، اس کے متعلق خود مغرب کے مفکرین سے پوچھئے جو چلّا رہے ہیں کہ اس قومیت پرستی نے ہمیں ہی نہیں، نوعِ انسان کو تباہ کر دیا ہے۔ ان کا اعلان ہے کہ:-

> جنگ کی بنیاد نیشنلزم ہے جس طرح افراد میں باہمی تنازع کی بنیاد جذبۂ انانیت ہوتا ہے۔ اس طرح جنگ کی ساری تاریخ کا سراغ، نیشنلزم میں ملے گا۔
>
> (میسٹی۔ بحوالہ انسان نے کیا سوچا؟ ص ۲۳۸)

ایک دوسرا مفکر کہتا ہے کہ:-

> تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی کچھ

اور ہو کہ قومیں، انسانوں کی مختلف جماعتیں تھیں جنہوں نے اپنے اپنے الگ نام رکھ لئے تھے۔ (فریڈرک ہرٹز۔ بحوالہ ایضاً ص۲۳۹)

نیشنلزم جو کچھ ہیں الاقوامی سطح پر عالم گیر انسانیت کے ساتھ کرتی ہے، مغربی نظامِ جمہوریت وہی کچھ ایک ملک میں بسنے والی قوم کے ساتھ کرتا ہے۔ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے جو ہر وقت باہمدگر برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ ان کی یہ باہمی جنگ، عام حالات میں "سرد جنگ" ہوتی ہے۔ لیکن انتخابات کے زمانے میں یہ آتشیں شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں ایک طرف برسرِ اقتدار پارٹی ہوتی ہے اور اس کے مدِمقابل، حزب یا احزاب اختلاف۔ اس باہمی جنگ میں کس قدر انسانیت سوز مظاہرے ہوتے ہیں وہ دنیا کے سامنے ہیں۔ ہندوؤں میں ایک تیوہار ہوتا ہے جسے ہولی کہتے ہیں۔ اس میں ہر شخص کو اس کی آزادی اور حق ہوتا ہے کہ وہ دوسروں پر راکھ۔ مٹی۔ دھول۔ گوبر۔ کوئلہ پھینکے یا رنگ ڈال کر ان کے چہرے مسخ اور کپڑے شرابور کر دے۔ وہ سارا دن یہی کچھ کرتے اور ادھم مچاتے رہتے ہیں۔ جو کچھ وہ ایک دن کرتے ہیں، انتخابات میں وہی کچھ مہینوں ہوتا رہتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ ہولی میں راکھ اور مٹی ہی پھینکی جاتی ہے، ایک دوسرے کے خلاف زبان درازی نہیں کی جاتی۔ لیکن انتخابی مہم میں ایک دوسرے کے خلاف جس جس قسم کی الزام تراشیاں، طعن و تشنیع اور غلیظ سے غلیظ ترگالیاں برسائی جاتی ہیں، مہذب اور شریف انسانوں کی دنیا میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سب مغرب کے جمہوری نظام کی برکات ہیں۔ ہولی تو ایک دن میں ختم ہو جاتی ہے، لیکن جمہوری نظام میں، پارٹیوں میں باہمی جذباتِ نفرت اور عداوت مستقل شکل اختیار کر لیتے ہیں جن کا مظاہرہ روزمرہ کی زندگی میں بالعموم، اور پارلیمان کے ایوانات میں بالخصوص سال بھر ہوتا رہتا ہے۔ بعض اوقات یہ تصادم اس قدر شدت اختیار کر جاتا ہے کہ فریقین میں جنگ کی سی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ حزبِ اقتدار کو قانون۔ پولیس یا فوج کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ حزبِ اختلاف کے پاس یہ کچھ نہیں ہوتا۔ وہ ان کے مقابل، عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے مظاہرے اور ہنگامے کراتے ہیں۔ ان کے تزاحمات میں جانیں ہلاک ہوتی ہیں، املاک ضائع ہوتی ہیں۔ نظم و نسق درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ملک کی اکانومی (معیشت) تباہ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے، ان تصادمات میں ملک کی آبادی کا بہت قلیل حصہ ملوث ہوتا ہے۔ ملک کی کثیر آبادی ان سے الگ ہوتی اور ان ہنگاموں کے سخت خلاف ہوتی ہے۔ لیکن جمہوری نظام میں اس کا کوئی انتظام نہیں ہوتا کہ جب یہ دو پارٹیاں اس طرح آپس میں الجھ پڑیں تو کوئی تیسری قوت، ثالث کی حیثیت اختیار کر کے، کشتی لڑنے والے ان دو پہلوانوں کو چھڑا دے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ باکسنگ کا مقابلہ تو بڑی تندہی اور تیزی کے ساتھ ہو رہا ہو لیکن رنگ میں ریفری نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس طرح یہ باکسر

لہولہان ہو جائیں گے ۔۔۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی اپنی جان بھی کھو بیٹھے۔

باکسنگ کے رنگ میں تو یہ مقابلہ دو باکسروں کے درمیان ہوتا ہے۔ ریفری کے نہ ہونے سے اگر ہڈی پسلی ٹوٹے گی، یا ہلاکت ہوگی تو ایک یا دو افراد کی ہوگی۔ ملک اور قوم پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کے ان تصادمات میں ملک برباد اور قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ قوم کا امن پسند طبقہ، جس کا اِن متصادم گروہوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا، ملک اور قوم کی اس تباہی پر خون کے آنسو بہاتا ہے لیکن چونکہ جمہوری نظام کے آئین میں ایسی کوئی تدبیر نہیں ہوتی جس کی رو سے یہ طبقہ بڑھ کر انہیں چھڑا سکے اس لئے یہ اپنے آپ کو بےبس محسوس کرتا ہے۔ ان کی یہی بےبسی ہے جس سے ان پر مایوسی طاری ہو جاتی ہے۔

سیکولر نظام میں اس قسم کے مظاہرے شاذ و نادر ہی ایسی شدت اختیار کرتے ہیں جن سے ملک کی تباہی ظہور میں آئے۔ اِس لئے کہ وہاں ہر مطالبہ آئین اور قانون کی سند کے ساتھ پیش کیا جاتا اور دلائل و براہین کی رو سے پرکھا جاتا ہے۔ لیکن مذہب پرست ممالک میں صورت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ان میں اگر مذہبی پیشوائیت خود ایک پارٹی بن جائے، یا کسی پارٹی کی حامی، تو اس کے لئے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ وہ فریقِ مقابل کے کسی قول یا فعل کے متعلق کہہ دے کہ وہ خلافِ شریعت ہے۔ اس سے عوام کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور وہ مرنے مارنے تک کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، کیونکہ انہیں بتایا جاتا ہے کہ یہ "جہاد" ہے جس میں کسی کو مارنے سے انسان غازی بن جاتا ہے اور مرنے سے شہید۔ نیز اس میں باہمی مفاہمت (COMPROMISE) کی صورت بھی نہیں نکل سکتی۔ اس لئے کہ جو مطالبہ عقل و فکر کی رو سے پیش کیا جائے، عقل و فکر ہی کی رو سے اس میں باہمی مفاہمت اور مصالحت کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن جب کسی مطالبہ کو "شریعت کا حکم" کہہ کر پیش کر دیا جائے تو اس میں رد و بدل تو ایک طرف، کمی بیشی بھی شرعاً جائز نہیں سمجھی جاتی اسی لئے اس میں مفاہمت کی گنجائش ہی باقی نہیں ہوتی۔

یہ ہے مغرب کا جمہوری نظام۔ یہ نظام سیکولر ممالک میں بھی کچھ کم خرابیوں کا موجب نہیں ہوتا لیکن جب اسے کوئی مذہب پرست ملک اختیار کرے تو اس کی پیدا کردہ تباہیاں حدود فراموش ہو جاتی ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نظام میں جس چیز کو "اقتدار" کہہ کر پکارا جاتا ہے اور جو ان تمام باہمی تصادمات اور جنگ و جدل کی بنیاد قرار پاتا ہے، وہ اقتدار ہوتا کیا ہے، وہ اقتدار ہوتا ہے قانون سازی کا لامحدود اختیار۔ اس میں حزبِ اقتدار جس قسم کی من مانی کرنا چاہے، بلا روک ٹوک کر سکتا ہے۔ اس کے لئے اُسے بس اتنا ہی کرنا ہوتا ہے کہ ایک قانون وضع کر لے۔ اس کے بعد اس کی ہر کارروائی قانونی اور آئینی قرار پا جاتی ہے۔ جس کے خلاف کہیں داد فریاد نہیں ہو سکتی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ اقتدار، ایسا حدود فراموش ہے جس کے سامنے ہلاکو اور چنگیز

کا استبداد کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اور تماشا یہ کہ ہلاکو اور چنگیز تاریخ میں بدنام، اور جمہوری نظام میں یہ استبداد، عین تقاضائے عدل و انصاف!

اس کے برعکس قرآن کا شورائی نظام دیکھئے تو نہ صرف یہ کہ اس میں اس قسم کی کوئی خرابی نہیں ہوتی بلکہ وہ ان تمام خرابیوں کا ازالہ کر دیتا ہے۔ اس میں پہلی اور بنیادی شق یہ ہے کہ پوری کی پوری اُمت ایک ناقابلِ تقسیم وحدت (INDIVISIBLE UNIT) ہوتی ہے جسے پارٹیوں میں تقسیم ہی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنِ کریم کی رو سے اُمت میں پارٹیوں کا وجود (خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو یا سیاسی پارٹیوں کی صورت میں) شرک ہے۔ شرک کے معنی ہیں مملکت کے اندر ایک اور مملکت (STATE WITHIN A STATE) قائم کرنا جسے کسی صورت میں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اگر امت کے اندر کوئی پارٹی پیدا ہو جائے اور مملکت اسے، برداشت کر لے، تو نہ وہ مملکت اسلامی کہلا سکتی ہے نہ اس کا نظام، اسلامی نظام ——— اور جب اس میں پارٹیوں کا وجود ہی نہیں ہوتا، تو متضاد مفادات کے ٹکراؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا بنا بریں، نہ اس میں باہمی عداوت ہوتی ہے، نہ نفرت۔ نہ رقابت ہوتی ہے، نہ مخاصمت۔ اس میں تمام افراد بھائیوں کی طرح رہتے ——— اور جذبۂ محبت سے سرشار ہوتے ہیں۔ اس میں کسی کو بلا حدود و قیود قانون سازی کا اختیار حاصل نہیں ہوتا اس لئے اس اقتدار کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا جس کے حصول کے لئے، مغرب کے جمہوری نظام میں ہر وقت سر پھٹول ہوتی رہتی ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے تمام گوشوں سے متعلق اصول اور حدود موجود ہوتے ہیں اور اُمت کا فریضہ اتنا ہی ہوتا ہے کہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، ان اصولوں کو معاشرہ میں عملاً نافذ کرنے کے طریق وضع کرے۔ انہیں آپ جزئی قوانین (BYE-LAWS) کہہ لیجئے۔ یہ اصول و حدود خدا کی کتاب میں موجود ہیں جن میں نہ کسی قسم کا تغیر و تبدل ہو سکتا ہے نہ حک و اضافہ۔ کوئی ایک ادارہ تو کجا، ساری کی ساری اُمت بھی ان میں سے ..... کسی اصول کی خلاف ورزی نہیں کر سکتی۔ اس مقصد کے لئے اُمت ایک مختصر سا مشاورتی بورڈ قائم کر لیتی ہے جو ایسے افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو کتاب اللہ میں عطا کردہ اصول و اقدار و احکام و قوانین کو اچھی طرح سمجھتے ہوں اور معاشرہ میں ان کے نفاذ کا طریق جانتے ہوں۔ اس بورڈ کے ممبران کو اقتدار تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا لیکن ذمہ داریوں کا بوجھ بڑا گراں ہوتا ہے اس لئے اس کی رکنیت (ممبرشپ) کی طرف لپکنا تو ایک طرف، ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ بوجھ ان کے کندھے پر نہ ہی رکھا جائے تو اچھا ہے۔ باقی رہا اس بورڈ کی کارکردگی پر نگۂ احتساب، سو اس معاشرہ میں قرآنِ کریم کی تعلیم اس قدر عام ہوتی ہے کہ ایک بڑھیا بھی جانتی ہے کہ (مثلاً) اس میں مہر کے متعلق کیا اصول دیا گیا ہے۔ اور اگر ایسا ہو کہ کسی کا کوئی قدم سہواً ان اصولوں کے خلاف اٹھے تو افرادِ معاشرہ میں روحِ حریت اتنی بیدار ہوتی ہے کہ وہ بڑی

سے بڑی شخصیت کو بھی بے دھڑک ٹوک سکتے ہیں۔ اُمت کی یہی نگہِ احتساب اور جرأتِ بیباک ہے جو ان اربابِ نظم و نسق کو پابندِ حدود رکھتی ہے اور اس سے کہیں زیادہ یہ احساس کہ وہ اپنے ہر عمل کے لئے خدا کے ہاں جواب دِہ ہیں۔ بنا بریں، اس نظام میں اُمت نہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتی ہے، نہ اس پر مایوسی طاری ہو سکتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس نظام میں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف میں زور آزمائی کا تصور تک نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں ان متخالف احزاب، (پارٹیوں) کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ البتہ اگر کہیں ایسا ہو کہ امت کے دو گروہوں میں کوئی جھگڑا ہو جائے تو یہ نظام آگے بڑھ کر ان میں صلح کرا دیتا ہے (دیکھئے ۴۹/۹)

یہ ہیں اسلامی نظام کے وہ نمایاں خط و خال جنہیں نہایت مختصر الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کی تفصیل کی ضرورت اس لئے نہیں کہ ہم اس موضوع پر شروع سے بڑی شرح و بسط سے لکھتے چلے آرہے ہیں (یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ، اسی اشاعت میں چند صفحات آگے جا کر، پرویز صاحب کا ایک تفصیلی مقالہ اسی موضوع پر آپ کے سامنے آ رہا ہے) جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے، ملک کی موجودہ متخاصم پارٹیاں تو اس (MOOD) ہی میں نہیں کہ وہ ان باتوں کو سننے کے لئے بھی آمادہ ہو سکیں، چہ جائیکہ وہ مغرب کے جمہوری نظام پر لعنت بھیج کر، قرآنی نظام اختیار کر لیں۔ ہم نے اس نظام کے نمایاں خط و خال کو طلوعِ اسلام کے صفحات میں اس لئے محفوظ کر دینا ضروری سمجھا ہے کہ اگر یہ خطۂ زمین محفوظ رہ گیا تو بعد میں کوئی اور گروہ ایسا پیدا ہوگا جو ان نشاناتِ راہ کو جادۂ منزل سمجھ کر اس پر گامزن ہو جائے گا۔ قرآنِ کریم سے ہمیں اسی قسم کے اشارات ملتے ہیں
نے کہا ہے کہ:-

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸)

اگر تم اس نظام سے روگردانی کرو گے تو تمہاری جگہ ایک اور قوم (جماعت) لے لے گی اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔

اُس وقت شاید ہم نہ ہوں، لیکن ہمارے ثبت کردہ یہ نقوش ان کے سامنے ہوں گے۔ اگر انہوں نے ان سے کچھ بھی راہ نمائی حاصل کر لی، تو ہمیں ہماری کاوشوں کا کافی صلہ مل جائے گا۔

لِلّٰہِ الحمد

کہ قرآنِ مجید کے ضخیم انسائیکلو پیڈیا "تبویب القرآن" کی جلد اوّل کی طباعت قریب الاختتام ہے۔ لیکن چونکہ اس سے فائدہ اسی صورت میں اٹھایا جا سکتا ہے جب مکمل کتاب سامنے ہو (جو قریب ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل ہے) اس لئے اس کی تینوں جلدوں کو ایک ساتھ شائع کیا جائے گا۔ اس کی تیاری میں ادارہ دن رات مصروف ہے۔

باسمہٖ تعالیٰ

خیمہ افلاک کا اِستادہ، اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

"نظامِ مصطفیٰ" صلے اللہ علیہ وسلم

(کیا ہے، اور کس طرح قائم ہو سکتا ہے)

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"نظامِ مصطفیٰ" (صلے اللہ علیہ وسلم)

زندگی را می کند تفسیرِ نو!
می دہد ایں خواب را تعبیرِ نو

حالیہ مظاہروں اور ہنگاموں میں بہت سے نعرے بلند ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ بلند آہنگ نعرہ "نظامِ اسلام، نظامِ شریعت، اور (آخر الامر) نظامِ مصطفیٰ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے قیام کا دعویٰ یا مطالبہ تھا۔ چونکہ کسی نے ان نعروں یا اصطلاحات کا مفہوم واضح کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس لئے ملک کے متعدد گوشوں سے مجھے استفسارات موصول ہو رہے ہیں اور مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ میں ان کی وضاحت میں کچھ لکھوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس اہم اور بنیادی موضوع پر چالیس سال سے مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہوں۔ میری ہر تصنیف، مقالہ یا خطاب، حتیٰ کہ میرے قرآنی درس، اسی اجمال کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ تحریریں سینکڑوں (بلکہ ہزارہا) صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں، اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ ان بکھری ہوئی تفصیلات میں سے چند اہم نکات کو یکجا کر کے بارِ دیگر پیش کر دیا جائے۔ اصل یہ ہے کہ یہ نعرے حالیہ مظاہروں ہی میں بلند نہیں کئے گئے۔ یومِ تاسیسِ پاکستان سے اس قسم کی آوازیں اٹھنی شروع ہو گئی تھیں کہ اس مملکت کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے یہاں اسلامی نظام قائم ہوگا۔ اس تمام عرصہ میں ہر پارٹی نے دعویٰ کیا کہ وہ اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے میدانِ سیاست میں اتری ہے۔ ہر جماعت نے اسے اپنے منشور میں داخل کیا۔ ہر لیڈر کی تقریروں میں اسے دہرایا گیا۔ ہر اخبار میں اسے شہ سرخیوں کے ساتھ چھاپا گیا۔ اس سے (بظاہر) یہی ثابت ہوتا ہے کہ ملک کے ہر فرقہ، ہر پارٹی، ہر گروہ، ہر لیڈر، بلکہ ہر فرد کا مطمحِ نگاہ ایک ہے۔ مقصود و مطلوب ایک ہے۔ منتہیٰ ایک ہے۔ منزل ایک ہے۔ یعنی اسلامی نظام کا قیام۔ لیکن اس کے بعد حالت یہ ہے کہ ہر فرقہ دوسرے فرقے کے ساتھ دست بگریباں ہے۔ ہر پارٹی دوسری پارٹی کے خلاف نبرد آزما ہے۔ ہر لیڈر دوسرے لیڈر کے ساتھ برسرِ پیکار ہے۔ ہر فرد دوسرے فرد سے اُلجھ رہا ہے۔ سارا ملک تشتت و انتشار کی آماجگاہ بنے چلا آ رہا ہے۔ ساری قوم (گویا) میدانِ کارزار میں اتری ہوئی ہے، یہ باہمی تصادم و تزاحم عام

حالات میں بھی کچھ کم تاسف انگیز نہ تھا لیکن حالیہ ہنگاموں میں اس نے جو شدت اختیار کی، اس کی مثال بہت کم ملے گی۔ ذرا غور کیجئے کہ ان تصادمات میں فریقین (حزبِ اقتدار اور حزب، یا احزابِ اختلاف) کا دعویٰ ایک ہی تھا۔

باہمی تصادمات

یعنی اسلامی نظام کا قیام۔ اور پھر دونوں کے اختلاف کی سنگینی کا یہ عالم ہے کہ معاملہ گالی گلوچ، خشت باری اور گلوخ اندازی سے آگے بڑھ کر ڈنڈوں، دھماکوں، تلواروں، خنجروں سے گذر کر، گولیوں تک جا پہنچا۔ آپ سوچئے کہ کیا اس کا کبھی تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ کسی قوم کے سامنے نصب العین ایک ہو، مقصود و مطلوب ایک ہو، اور پھر ساری قوم مصروفِ جنگ و قتال ہو! ——— ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ چونکہ قوم نے سوچنا چھوڑ دیا ہے اس لئے وہ بہت جلد مشتعل ہو کر جذبات کی رو میں بہ نکلتی ہے۔ اگر قوم سوچتی تو وہ ہر دعویٰ کرنے والے سے پوچھتی کہ ہمیں متعین طور پر بتایئے کہ اسلامی نظام یا نظامِ مصطفےٰ (صلے اللہ علیہ وسلم) سے آپ کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مفہوم کیا ہے؟ اس کا واضح اور متعین نقشہ کیا ہے؟ کیا یہ ساری اُمت کے لئے ایک ہی ہوگا یا ہر فرقہ، ہر پارٹی، ہر جماعت، ہر گروہ کے لئے الگ الگ ہوگا؟ یہ پوچھتی اور جو جواب ملتا، اس کے متعلق دریافت کرتی کہ اس کی سند کیا ہے؟ اس کی اتھارٹی کیا ہے؟ اس کے صحیح ہونے کی دلیل کیا ہے؟ لیکن نہ اسلامی نظام کے مدعیوں نے اسے بتایا، اور نہ قوم نے پوچھا۔ اور باہمی رزم و پیکار کی آگ کے شعلے بھڑکتے چلے گئے ——— ہمارے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے اگر کچھ متعین مطالبات پیش کئے گئے تو وہ اس قسم کے تھے کہ شراب، جُوا، ریس، فحش لٹریچر اور سینما پر پابندیاں عائد کرو اور شرعی سزائیں نافذ کرو۔ منکرات پر پابندیاں برحق اور شرعی سزائیں بجا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان پابندیوں کے عائد کرنے اور ان سزاؤں کے نافذ کرنے سے اسلامی نظام قائم ہو جائے گا! کیا اسلام کا مقصود و منتہیٰ اتنا ہی ہے؟ (معاف فرمائیے) ان پابندیوں اور سزاؤں کو تو دنیا کی ہر حکومت چاہے اپنے ہاں رائج اور نافذ کر سکتی ہے۔ کیا اتنے سے وہ حکومت اسلامی بن جائے گی؟ اصل یہ ہے کہ چونکہ اسلام دین نہیں رہا۔ مذہب بن چکا ہے، اس لئے ہماری مذہبی پیشوائیت کے ذہن میں نظام کا تصور آ نہیں سکتا۔ ان کے نصابِ تعلیم میں "نظام" کا نام تک نہیں ملے گا۔ ان کی نگاہ فقہی احکام اور مسائل سے آگے جا نہیں سکتی۔ اور چونکہ فقہی احکام و مسائل بھی ہر فرقہ کے الگ الگ ہیں، اس لئے وہ اسلامی نظام کے اس محدود سے تصور کا بھی کوئی متفق علیہ مفہوم پیش نہیں کر سکتے۔ یہ وجہ ہے جو وہ ان الفاظ کو نعرے کے طور پر تو استعمال کرتے ہیں، ان کی وضاحت نہیں کرتے۔ مودودی صاحب نے تو بہت پہلے اعتراف اور اعلان کر دیا تھا کہ "پبلک لاز کے متعلق کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر پیش نہیں کی جا سکتی جو مختلف فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو"۔ سو جب "کتاب و سنت" کی متفق علیہ تعبیر ناممکن ہے، تو "اسلامی نظام" کا کوئی متفق علیہ مفہوم کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

احکام و تعزیرات کو چند عام فہم الفاظ میں سمجھایا جا سکتا ہے لیکن نظام ایک ایسا محیطِ کل اور ہمہ گیر تصورِ حیات اور نظریۂ زندگی ہے جسے چند الفاظ میں بتایا اور سمجھایا نہیں جا سکتا۔ خود قرآن کریم نے بھی اسے

احکام و نظام میں فرق

تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نے اسے صِبْغَةَ اللّٰهِ (۲/۱۳۸) "اللہ کا رنگ" کہہ کر پکارا ہے۔ "رنگ" کے متعلق آپ جانتے ہیں کہ اسے الفاظ میں سمجھانا مشکل (بلکہ بعض اوقات ناممکن) ہوتا ہے۔ جس شخص نے کبھی سبز رنگ نہ دیکھا ہو، آپ اسے قیامت تک نہیں سمجھا سکتے کہ سبز رنگ کسے کہتے ہیں۔ صبغۃ اللہ کی قرآنی مثال بڑی ہی جامع اور ہمہ گیر ہے۔ جب کوئی کپڑا کسی خاص رنگ میں ڈبو دیا جائے تو وہ تمام کا تمام ایک رنگ ہو جاتا ہے۔ اسلامی نظام میں ہر فرد کی پوری کی پوری زندگی ایک رنگ ہو جاتی ہے اور جب ہر فرد کی زندگی یک رنگ ہو جائے تو ساری کی ساری جماعت (اُمت) یک رنگ ہو جاتی ہے۔ یہ ہے اسلامی نظام کے قیام کی شرطِ اوّلین۔ یعنی پوری کی پوری اُمت کا ایک رنگ اور ہم آہنگ ہونا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

چیست ملت، ایکہ گوئی لا الٰہ — با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

لہٰذا، جو اُمت فرقوں، پارٹیوں، گروہوں، جماعتوں میں بٹی ہوئی ہو، اس میں اسلامی نظام کا قیام تو ایک طرف، اس کا تصور تک بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فرقوں اور پارٹیوں میں بٹی ہوئی اُمت کا دعویٰ نظامِ مصطفےٰ تھا جس کے احساس و تصور سے تڑپ کر، اقبالؒ نے باصد سوز و گداز کہا تھا کہ: ؎

تا نداری از محمدؐ رنگ و بو — از درود خود میالا نام او

"محمدیؐ رنگ و بو" صبغۃ اللہ ہی کی محسوس شکل کا نام ہے۔ خدا کا رنگ، اسوۂ محمدیؐ کے مرئی پیکر میں سامنے آ سکتا ہے۔ یورپ دینِ خداوندی، اسلامی نظام اور نظامِ مصطفےٰ ایک ہی حقیقت کے مختلف نام قرار پاتے ہیں۔

نفسیاتی تبدیلی

سوال یہ ہے کہ اُمت میں اس قسم کی یک رنگی اور ہم رنگی پیدا کس طرح سے ہوتی ہے؟ قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ یک رنگی پیدا ہوتی ہے افراد کے نفسیاتی تغیر، ان کی ذہنیت کی تبدیلی سے۔ ارشادِ خداوندی ہے:-

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱)

کسی قوم کی خارجی دنیا میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس کی داخلی دنیا، اس کے افراد کی نفسیات، ان کی ذہنیت میں تبدیلی نہ ہو۔

افراد کے قلب و نگاہ میں یہ تبدیلی، قرآن کریم پر غور و فکر سے پیدا ہوتی ہے ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود!

حضور نبی اکرمؐ کا فریضہ، يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔ (۶۲/۲ و دیگر مقامات) بتایا گیا ہے۔ یعنی قرآنی قوانین اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم اور اس طرح افرادِ اُمت کی ذات کی نشوونما۔ یہ تھا تغیرِ نفس کا پروگرام جسے حضورؐ نے تیرہ سال تک مکی زندگی میں جاری رکھا۔ غور فرمائیے۔ حضورؐ کی عمر نبوت (تئیس سال) میں سے قریب ساٹھ فیصد حصہ اسی پروگرام میں صرف ہو گیا۔ لیکن اس کے

بغیر اسلامی نظام یا نظامِ مصطفٰےؐ کا قیام ناممکن تھا۔ جب ان افراد میں جن کی تعداد تین چار سو سے زیادہ نہیں تھی، اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو گئی تو پھر اس نظام کی تشکیل کے لئے قدم اٹھایا گیا۔۔۔ اس طرح قائم ہوتا ہے اسلامی نظام!

قلب و نگاہ کی اس تبدیلی سے کیا ہوتا ہے؟ اس سے اشیائے کائنات کی قدر و قیمت بدل جاتی ہے۔ اس سے اقدار (VALUES) کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ (مثلاً) نگاہ کا زاویہ غلط ہو تو عزت و تکریم کا معیار، حسب و نسب، دولت و منصب، وجاہت و اقتدار ہوتا ہے۔ جب اقدار کا پیمانہ بدل جاتے تو ان سب کے خلاف، عزت و تکریم کا معیار، جوہرِ ذاتی، پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ کردار قرار پاتا ہے۔ حضرات انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد ہی عالمِ انسانیت میں اقدار کے پیمانوں کو بدل دینا تھا۔ اس حقیقتِ کبریٰ

اقدار میں تبدیلی

کو علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> رسول، اس لئے آتا ہے کہ زمانے کے طوفانوں پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے (مضراب وحی سے) اس کے نفسِ قدسی میں ایسی ولولہ انگیز قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب برپا کر دیں۔ یہ آرزو، کہ جو کچھ اس نے (وحی کی روشنی میں) دیکھا ہے، وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اس لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریق یہ بھی ہوتا ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے، وہ کیا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔

بالفاظِ دیگر، ایک رسول آتا اس لئے تھا کہ جو دنیا اس کے سامنے ہو اس کی جگہ ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ خارجی کائنات میں ایک نئی دنیا بسانے کے لئے، اُسے دلوں کی دنیا کو بدلنا پڑتا ہے۔ انسانی فکر و نظر میں ایک انقلابِ عظیم برپا کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ:۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

وہ دنیا کے مروجہ باطل اعتقادات، نظریات، تصورات، خیالات کی ایک ایک کر کے لیتا ہے اور ان کی بنیادوں تک کو اکھیڑ کر، ان کی جگہ جدید تصورات و نظریات کی دنیا بساتا ہے۔ وہ نگاہوں کے زاویے بدل دیتا ہے۔ وہ اقدار کے پیمانے بدل دیتا ہے، وہ خیر و شر کا معیار بدل دیتا ہے، وہ نصب العین حیات بدل دیتا ہے۔ وہ کاروانِ انسانیت کی منزلِ مراد بدل دیتا ہے، وہ زندگی کا مقصود بدل دیتا ہے مقصود کا مفہوم بدل دیتا ہے۔ غرضیکہ وہ، قرآن کی زبان میں ۔۔۔ یہ زمین بدل دیتا ہے، یہ آسمان بدل دیتا ہے اور ان کی جگہ ایک نئی زمین کی تخلیق کرتا ہے۔ ایک نیا آسمان وجود میں لاتا ہے۔ اس کی نگاہ انسانی فکر کی دنیا میں زلزلہ پیدا کر دیتی ہے جس سے ہر پرانے کہنہ ویران ہو جاتی ہے اور اس تخریب کے بعد وہ فکر و نظر کے ان ۔۔۔

دیوانوں میں، دنیائے تصورات کی ایک نئی جنت آباد کرتا ہے۔ ایک رسول درحقیقت

پیغام بَرِ انقلاب

ہوتا ہے۔ ایک عظیم انقلاب کا پیغام بر —— ایسے عظیم انقلاب کا پیغام بر جس کا تصور تک بھی فکرِ انسانی نہیں کر سکتی۔

مختصر الفاظ میں، رسول کا پیغام: ؎

زندگی را می کند تفسیر نَو　　می دہد ایں خواب را تعبیرِ نَو

یہ ہے اسلامی نظام کی اصل و حقیقت۔ ظاہر ہے کہ عالمِ انسانیت میں اس قسم کی تبدیلی نہ تو چند ممنوعات پہ پابندیاں پیدا کر سکتی ہیں، اور نہ ہی چند سزائیں۔ ہمارے ہاں —— اور ہمارے ہاں ہی کیا، اس وقت ساری دنیا میں —— اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی کا تصور ہی کہیں نہیں جو اقدارِ خداوندی کی رو سے پیدا ہوتی ہے۔ اربابِ مذہب کا منتہیٰ چند احکام کی میکانکی پابندی اور چند "عبادات" کی رسمی ادائیگی اور مہرہ بازانِ بساطِ سیاست کا مطلوب حصولِ اقتدار سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا، اسلامی نظام نہ ان کے ہاتھوں قائم ہو سکتا ہے، نہ اُن کے۔ یہ بہت دُور کی کوڑی لائیں گے تو اسلامی مملکت کا قیام اپنا نصب العین بتائیں گے۔ لیکن اسلامی نظام کے نقطۂ نگاہ سے، اسلامی مملکت بھی مقصود بالذات نہیں ہوتی، وہ قرآنی اقدار کو تمدنی قالب میں ڈھالنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

> اسلامی نقطۂ نگاہ سے مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زمان و مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت، ان بلند تصورات کو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔ (خطبۂ الٰہ آباد)

بنابریں، جسے اسلام کا سیاسی نظام۔ اسلام کا معاشی نظام۔ اسلام کا معاشرتی نظام (وغیرہ) کہیں گے، وہ بھی اسلامی نظام کے مختلف گوشوں (ASPECTS) ہوں گے۔

سائیکالوجی نہیں

اوپر کہا گیا ہے کہ نظامِ اسلام کی عمارت، نفسیاتی تبدیلی پر استوار ہوتی ہے۔ اس سے ذہن سائیکالوجی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، کیونکہ ہمارے زمانے میں اس کو علم النفس کہا جاتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کی رو سے نفس کا تصور اس سے مختلف ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف اس کی طبعی زندگی نہیں جو آب و گِل کا کھیل ہے اور موت اس کھیل کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس کی رو سے، طبیعی زندگی کے علاوہ انسان ایک اور شے کا بھی حامل ہے جسے اس کی ذات کہتے ہیں۔ انسان کا ہر عمل اس کی ذات پہ ایک اثر مرتب کرتا یا ایک نقش چھوڑتا ہے۔ اس کے جو اعمال، اقدارِ خداوندی کے مطابق ہوں، ان کے اثرات سے انسانی ذات نشوونما پاتی اور مستحکم ہوتی ہے۔ جو ان کے خلاف ہوں، ان کے نقوش سے یہ مضمحل ہوتی ہے۔

مرنے کے بعد، انسانی ذات ان تمام اثرات و نقوش کو اپنے ساتھ لئے آگے بڑھ جاتی ہے اور اس کی آئندہ زندگی، اس کی ذات کی کیفیت کے مطابق مرتب ہوتی ہے۔ اگر وہ نشوونما یافتہ اور مستحکم ہوتی ہے تو یہ فرد، جنّتی زندگی کا مستحق قرار پاتا ہے جس میں مزید ارتقائی منازل کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ اگر یہ

قانونِ مکافاتِ عمل

مضمحل ہو تو اس کی نشوونما کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ اسے جہنمی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اعمال، ان کے نتائج و اثرات، اور ان کے مطابق مستقبل کی زندگی کا تعین، قانونِ مکافاتِ عمل کہلاتا ہے۔ اس قانون کی صداقت اور محکمیت پر ایمان، نظامِ اسلام کا سنگِ بنیاد ہے۔ یہ ایمان، جرم اور سزا کا سارا مسئلہ حل کر دیتا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں جرائم اس ایمان کی وجہ سے ختم ہو جاتے ہیں، نہ کہ سزاؤں کی سختی کی وجہ سے۔ پاکستان میں جرمِ قتل کی سزا موت ہے۔ یہ سخت ترین سزا ہے اور شریعت کے مطابق۔ مجرم آئے دن پھانسی کے تختے پر لٹکائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود جرمِ قتل کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ سو، مجرد سزا کی سختی جرائم کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔

اسلامی نظام کے اس تمہیدی تعارف کے بعد، اس کی چند ایک امتیازی خصوصیات کی طرف آئیے۔

غلامی سے رستگاری

اس نظام کی اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا نہ محکوم ہوتا ہے نہ محتاج —— مختصر الفاظ میں، یہ نظام —— موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے —— ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے حضور نبی اکرمؐ کی بعثت کے اس اوّلین مقصد کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ: وَ يَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (7/157) "وہ انسانیت کے سر سے ان تمام بوجھل سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے وہ دبی پڑی تھی، اور ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں وہ جکڑی چلی آ رہی تھی۔ اُس وقت، اقبالؒ کے الفاظ میں حالت یہ تھی کہ :-

بود انسان در جہاں انساں پرست — ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش — بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر — بہرِ یک نخچیر، صد نخچیر گیر

یہاں اقبالؒ نے ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی غلامی کا ذکر کیا ہے۔ دیگر مقامات پر انہوں نے —— سودخوار و والی و ملّا و پیر —— کہہ کر اُس میں تیسری غلامی، نظامِ سرمایہ داری کی بتائی ہے۔ نظامِ اسلام، ان تینوں انسانیت کش نظاموں کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :-

إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ۔

یہ علماء و مشائخ جو بڑے مقدس بنے پھرتے ہیں، ان میں سے اکثریت کی یہ حالت ہے کہ یہ لوگوں کا مال حرام طور

پر کھا جاتے ہیں اور ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ یہ لوگ کہیں خدا کے صحیح نظام کو قائم نہ کر لیں اس لئے کہ صحیح نظامِ خداوندی میں ان کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ باقی رہے وہ سرمایہ دار جن کے ہاں اکتناز ہوتے ہیں تو سن رکھو کہ :-

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۹/۳۴)

جو لوگ دولت کے ڈھیر جمع کرتے ہیں اور اُسے ضرورتمندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے عام نہیں کرتے، ان سے کہہ دو کہ ان کی اس روش کا نتیجہ ایسی تباہی ہوگی جس سے وہ چیخ اٹھیں گے۔

باقی رہا نظامِ حکومت، تو اس کے لئے خدا نے اعلان فرما دیا کہ :-

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ۝ (۳/۷۸)

کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین۔ حکومت، حتّیٰ کہ نبوت تک بھی دے دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم قانونِ خداوندی کی نہیں بلکہ میری محکومی اختیار کرو۔ اسے صرف یہ کہنا چاہیئے کہ اس ضابطۂ قوانین کی رُو سے ربّانی بن جاؤ جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کی تعلیم کو تم اپنے دل پر نقش کرتے ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک اعلان سے قرآن نے کس طرح حکومت کے تصوّر کو بنیادی طور پر بدل دیا ـــ اعلان یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق ہی حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر اپنا حکم چلائے خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔ حکومت صرف قانون کی ہوگی اور قانون بھی وہ جو خدا کا عطا کردہ ہو، کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کا وضع کردہ نہ ہو۔ حضور نبی اکرمؐ خود قریب دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کے حکمران تھے۔ لیکن حکمرانی میں احساسِ حاکمیت تو ایک طرف کسی امتیازی شان کے پیدا نہ ہونے دینے کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ کسی نے آپؐ سے خطاب کرتے ہوئے کہہ دیا ـــ سیّدنا! اے ہمارے آقا ـــ تو اس پر آپؐ نے ڈانٹ کر کہا کہ دیکھو! تمہیں شیطان بہکا رہا ہے۔ آقا، صرف خدا کی ذات ہے۔ میں تو عبداللہ کا بیٹا محمدؐ، خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ آقائیت صرف ذاتِ خداوندی کے لئے ہے اور کسی کے لئے نہیں ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آذری !

آپ نے، مملکت کے اربابِ بست و کشاد کے لئے حکّام کے بجائے عمّال کی اصطلاح رائج فرمائی جس کے معنی حکم چلانے والے نہیں بلکہ کام کرنے والے (کارندے) کے ہیں۔ ان عمّال کو تملق پیشہ مصاحبوں کے نرغے سے بچانے کے لئے آپ نے یہاں تک فرمایا کہ اگر کسی شخص نے حاکم کو خوش کرنے کے لئے ایسی بات کہہ دی جس سے اُس کا خدا ناراض ہو جائے (یعنی وہ قانونِ خداوندی کے خلاف ہو) تو وہ اللہ کے دین سے نکل گیا۔

تکریمِ انسانیت

اگرچہ غلامی سے رستگاری بہت بڑی کامیابی اور فیروزمندی ہے لیکن یہ بہرحال منفیانہ پہلو ہے۔ یہ اس نظام کا حصۂ لَا ہے۔ جہاں تک حصۂ اِلَّا کا تعلق ہے، وہ اس کی ابتداء اس سے کرتا ہے کہ:-

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)

جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی حیثیت سے، یکساں طور پر واجب التکریم ہے۔ اس میں رنگ، نسل، زبان، ملک، قوم، حسب، نسب، امارت، افلاس وغیرہ کی کوئی تمیز نہیں۔ ہر انسان، بہ حیثیت انسان، یکساں عزت کا مستحق اور تعظیم کا سزاوار ہے۔ عملاً اس اصول کے بنیادی معنی یہ ہیں کہ، اسلامی مملکت نہ کوئی ایسا قانون بنا سکتی ہے اور نہ معاشرہ میں ایسا نظریہ رائج ہونے دے سکتی جس کی رو سے کوئی انسان (پیدائشی یا پیشہ کی) اضافی نسبتوں سے شریف یا ذلیل تصور کیا جائے۔ معاشرہ میں عزت کے مدارج، جوہرِ ذاتی کے مطابق متعین ہوں گے۔ (وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔ ۴۶/۱۹)

(۲) تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب العزت سمجھنا۔ ہر ایک کو اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں مواقع مہیا کرنا اور سعی و عمل کے لحاظ سے ان کے مقامات و مدارج کا تعین کرنا اس نظامِ خداوندی کا شرِ اوّلیں ہے۔ اس سے ذات، گوت، برادری کے تمام امتیازی نشانات ختم ہو جاتے ہیں، اور وراثتی مناصب و اقتدار حرفِ غلط کی طرح محو ہو جاتے۔ ہر انسانی بچہ سادہ لوح لے کر پیدا ہوتا ہے اور سب کے لئے سعی و عمل کے میدان یکساں کھلے ہوتے ہیں۔

جنسی مساوات

قرآنِ کریم نے جب یہ کہا کہ ہر انسانی بچہ، پیدائشی طور پر یکساں واجب التکریم ہے، تو اس میں لڑکا اور لڑکی دونوں شامل ہیں۔ لہٰذا اس نظام میں جنسی تفریق نہ وجۂ ذلت ہوتی ہے، نہ باعثِ عزت —— یعنی، نہ مرد، محض مرد ہونے کی حیثیت سے، عورتوں سے افضل ہیں اور نہ ہی عورتیں، محض عورت ہونے کی بنا پر، مردوں سے کہتر۔ زندگی کی ابتدا نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے۔ (خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔ ۴/۱) قرآن کا ارشاد ہے۔ ہر انسانی بچہ میں —— خواہ لڑکا ہو یا لڑکی —— کچھ حصہ مرد کا ہوتا ہے اور کچھ حصہ عورت کا —— اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى (۴۹/۱۳) اس لئے نہ مرد، عورتوں سے الگ کوئی نوع ہیں، نہ عورتیں، مردوں سے الگ کوئی جنس۔ دونوں نوعِ انسان کے افراد ہیں، اور جس مقام کا مستحق انسان ہے، اس میں مرد اور عورت، دونوں یکساں طور پر شریک ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے دروازے ایک صنف کے لئے کھلے رکھے جائیں، اور دوسری پر بند کر دیئے جائیں۔ حیاتیاتی طور پر (BIOLOGICALLY) مرد اور عورت کی ساخت میں جو فرق ہے اس کا تعلق ان کے طبیعی وظائفِ حیات سے ہے۔ انسانیت کی سطح پر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس میں عمل کا میدان بھی دونوں کے لئے یکساں ہے، اور اعمال کے نتائج بھی یکساں۔ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ (۳/۱۹۴) تم میں سے کسی کام کرنے والے کے

کام کا اجر ضائع نہیں ہو سکتا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت ـــــ مرد اور عورت کی تخصیص کے معنی کیا؟ تم ایک دوسرے کے اجزاء ہو۔ تم خلقت اور طینت کے اعتبار سے ایک ہو ـــــ زندگی کے تمام معاملات میں یکساں طور پر شریک رہتے ہو۔ تم ایک نوع کے فرد ہو۔ پھر اعمال کے نتائج میں فرق کس طرح ہو سکتا ہے؟

عصمت کی حفاظت

عصمت، انسان کی بے بہا متاع ہے۔ یہ وہ بلند ترین قدر ہے جو صرف انسان کا خاصہ ہے۔ حیوانات میں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ جنسی اختلاط ایک طبیعی جذبہ ہے جس میں انسان اور حیوان سب شریک ہیں۔ لیکن عصمت کا جذبہ صرف انسانی سطح زندگی کا تقاضا ہے۔ لہٰذا، قرآن کریم اس کی حفاظت کو مستقل حقِ انسانیت قرار دیتا ہے۔ اسی لئے اس نے اس حق کی پامالی کو ایک ایسا جرم قرار دیا ہے جس کی سزا بڑی سخت ہے۔ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (۲۴/۲)۔ زانی مرد ہو یا عورت۔ انہیں سو سو کوڑوں کی سزا دو۔

صرف جرمِ زنا کا ارتکاب ہی نہیں۔ اس کے نزدیک، شریف عورتوں کے خلاف تہمتِ بے جا بھی سنگین جرم ہے جس کی سزا اسی کوڑے ہے (۲۴/۴) اس لئے کہ اس سے بھی ان کی عصمت پر حرف آجاتا ہے۔

اور شریف زادیوں کو چھیڑنا اور تنگ کرنا۔ ان کے خلاف طعن آمیز اور اضطراب انگیز باتیں پھیلا کر لوگوں کے جذبات کو ان کے خلاف مشتعل کرنا، اس کے نزدیک، اس سے بھی بڑا جرم ہے۔ اس جرم کی پاداش میں اس نے کہا ہے کہ ایسے لوگوں کو شہر بدر کر دیا جائے۔ انہیں حقوقِ شہریت سے محروم کر دیا جائے۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو ان کے خلاف وارنٹ بلا ضمانت جاری کر کے انہیں گرفتار کیا جائے اور جرم ثابت ہونے پر انہیں قتل کیا جائے اس طرح کہ ان کی پارٹی کا کوئی فرد بھی سزا سے بچنے نہ پائے۔ وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا۔ (۳۳/۶۱) یہ وہ قانونِ خداوندی ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ:-

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۲)

یہی قانون، خدا نے اقوامِ سابقہ کو بھی دیا تھا۔ اور یہ ایسا محکم قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

شادی میں انتخاب کا حق

تعلقِ زوجین کے سلسلہ میں، قرآن کریم نے اس امر کی صراحت بھی کر دی کہ شادی کے لئے انتخاب کی آزادی بھی فریقین کو حاصل ہوگی۔ اس نے مردوں سے کہا کہ: فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ (۴/۳) تم اپنی پسند کی عورتوں سے شادی کرو۔ دوسری طرف یہ کہہ کر عورتوں کے حقِ انتخاب کی حفاظت کر دی کہ: لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا۔ (۴/۱۹)۔ تم عورتوں کے زبردستی مالک نہیں بن سکتے۔ نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں فریقین کی رضامندی بنیادی شرط ہے۔ اور ظاہر ہے کہ رضامندی، بالغ ہی کی ہو سکتی ہے۔ اس لئے نابالغ کی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس سلسلہ میں ضمناً اتنا اور واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، معاہدۂ نکاح کے بعد، خاوند اور بیوی کے حقوق اور ذمہ داریاں یکساں ہوتی ہیں ـــــ صرف ایک بات میں مرد کو رعایت دی گئی ہے ـــــ اور وہ یہ کہ طلاق (یا بیوگی) کی صورت، عورت کو عدّت کی مدّت میں نکاحِ ثانی کی اجازت نہیں ہوتی، اور مرد کے لئے کوئی عدّت نہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ یعنی ان دوران میں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ عورت حمل سے تو نہیں۔ یہ حکم، پیدا ہونے والے بچے کے حق کی حفاظت کے لئے ہے۔ یعنی یہ متعین کرنے کے لئے کہ وہ کس کا بیٹا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ط (۲/۲۲۸) عورتوں کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنی ان کی ذمہ داریاں ہیں۔ صرف ایک معاملہ ایسا ہے جس میں مرد کو ایک خصوصی درجہ حاصل ہے۔ (اور وہ یہ کہ اُسے عدّت نہیں گزارنی پڑتی)۔

حسنِ ذوق | اسلامی نظام، انسانی کے انفرادی ذوقِ حسن (AESTHETIC TASTE) کا احترام کرتا ہے اور کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اُسے، اس کے حق سے محروم کر دے۔ اس نے بڑی تحدی سے کہا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط (۷/۳۲) اُن سے کہو کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی اُن چیزوں کو جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے ذوق کی تسکین کے لئے بنایا ہے، اور خوشگوار سامانِ زیست کو، حرام قرار دے؟ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے اُن سے کیف اندوز ہونا، ہر فرد کا بنیادی حق ہے جس سے اُسے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ اصولاً یہ سمجھ لیجئے کہ جس چیز کو خدا نے حرام قرار نہیں دیا۔ اُسے کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا۔ یہ انسانی آزادی کو سلب کر لینے کے مرادف ہے جس کا حق کسی انسان کو نہیں پہنچتا۔ اسی ضمن میں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآنِ کریم حلال چیزوں کے کھانے پینے کے انداز اور رہنے سہنے کے طریق پر بھی کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا۔ بلکہ اس میں ہر ایک کو اس کے ذوق کے مطابق حقِ انتخاب دیتا ہے۔ اسی طرح وہ لباس کے معاملہ میں بھی وضع قطع اور تراش خراش پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا اور ہر ایک کے حسنِ ذوق کی رعایت رکھتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ لباس کا مقصد ستر پوشی کے علاوہ زینت بھی ہے۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ط (۷/۲۶) وہ سونے کے زیورات۔ چاندی اور شیشے کے برتن۔ باریک اور دبیز ریشمی ملبوسات۔ اعلیٰ درجے کے صوفے (۱۸/۳۱ ؛ ۷۶/۱۲ـــ۱۵) اور اسی قسم کا دیگر سامانِ آرائش و زیبائش، "جنتی زندگی" کا معمول قرار دیتا ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ اس دنیا میں بہ حیثیتِ مجموعی معاشرہ کا تمدنی معیار اتنا بلند ہونا چاہیئے کہ یہ چیزیں تمام افرادِ معاشرہ کو میسر ہوں۔ جنتی زندگی میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ایک خاص طبقہ ان آسائشوں سے بہرہ یاب ہوگا۔ اور دوسرے لوگ ان سے محروم ہوں گے۔ جنتی زندگی میں ہر ایک کو یہ کچھ میسر ہوگا۔ اور یہ تمام سامانِ آرائش و آسائش اسلامی نظام کی عطا کردہ نعما ہوں گی۔ جنتی زندگی کی ابتدا اسی دنیا سے ہو جاتی ہے۔ یعنی اسلامی نظام کے تحت زندگی بسر کرنا جنت بدامنی ہے۔ یہاں کی زندگی بھی جنتی اور آخرت کی زندگی بھی جنتی۔

رزق کا حق

انسان (بلکہ ہر ذی حیات) کی زندگی کا مدار، سامانِ زیست پر ہے۔ دنیا کا فیصلہ یہی ہے کہ یہ ہر فرد کی اپنی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اور اپنی اولاد کے لئے سامانِ زیست خود پیدا یا مہیا کرے۔ لیکن اسلامی نظام اس باب میں ساری دنیا سے منفرد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶) دنیا میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے سامانِ زیست کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ جن ذمہ داریوں کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، قرآنی نظام میں وہ ذمہ داریاں مملکت کی ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا، یہ قرآنی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ کوئی ذی حیات اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے؛ اور وہ تمام افرادِ معاشرہ سے علانیہ کہہ دے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ۔ (۶/۱۵۲) ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات پوری کرنے کے بھی۔

جہاں تک اولاد کے لئے رزق مہیا کرنے کا تعلق ہے اس میں ان کی صحیح تعلیم و تربیت بھی شامل ہے۔ کیونکہ جہاں قرآن نے کہا ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ (۶/۱۵۲) اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کر دو۔ تو اس میں "قتل" کے معنی جان سے مار ڈالنا ہی نہیں۔ اس سے مراد علم و تربیت سے محروم رکھنا بھی ہے۔ لہٰذا، قرآنی معاشرہ کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام بچوں کی عمدہ تعلیم و تربیت ہو۔ بنا بریں، اسلامی نظام میں، سب بچے، عمدہ پرورش اور صحیح تعلیم و تربیت بطور اپنے حق کے طلب کر سکتے ہیں، اور کوئی انہیں اس حق سے محروم نہیں کر سکتا۔

جان کی حفاظت

لیکن ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری سے پہلے، انسانی جان کی حفاظت کی ضمانت سامنے آتی ہے۔ قرآن کریم نے اس باب میں واضح طور پر کہہ دیا کہ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (۶/۱۵۲)۔ خدا نے انسانی جان کو واجب الاحترام قرار دیا ہے اس لئے کسی کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ کسی کو جان سے مار دے۔ ہاں! اگر حق کا تقاضا ہو تو ایسا کیا جا سکتا ہے! حق کے تقاضے کے کیا معنی ہیں، اسے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کر دیا کہ: مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔ اگر کوئی، کسی کو ناحق قتل کر دے، تو اس جرم کی پاداش میں اسے سزائے موت دی جا سکتی ہے۔ یا اگر کوئی شخص معاشرہ کے نظامِ عدل و امن کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرے۔ اور، کسی طرح، اپنی اس تباہ کن روش سے باز نہ آئے، تو اسے بھی موت کی سزا دی جا سکتی ہے۔ ایسی صورتوں کے علاوہ، اگر کوئی کسی انسانی جان کو ناحق تلف کر دے تو یوں سمجھو کہ اس نے ایک جان کو تلف نہیں کیا، پوری نوعِ انسان کو تلف کر دیا۔ اس کے برعکس:

وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (۵/۳۲)

جس نے کسی ایک انسان کی جان بچائی تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسان کی جان بچا لی۔

مذہبی آزادی

اسلامی نظام کے تابع، ہر انسان کو مذہبی آزادی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان نام ہے، کسی صداقت کو، عقل و فکر کی رو سے علیٰ وجہ البصیرت ماننے کا ــــ لہٰذا اس میں جبر و اکراہ کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ق فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ (۱۸/۲۹) ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے (اس قرآن میں) آچکا ہے۔ تم اس پر غور و فکر کرو، اور اس کے بعد، جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرلے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ اس نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ خارجی کائنات اور انسان میں بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے اُس راستے پر چلنے کے لئے مجبور ہے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ لیکن انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اُسے راستہ دکھا دیا گیا ہے اور اس کے بعد، یہ اس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس راستے کو اختیار کرے، یا اس سے انحراف برتے۔ وہ اگر اسے اختیار کرے گا تو اس کی زندگی خوشگواریوں میں بسر ہوگی۔ اس سے سرتابی برتے گا، تو نقصان اٹھائے گا۔ اگر اُسے مجبوراً صحیح راستے پر چلانا مقصود ہوتا تو اسے بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح، مجبور پیدا کر دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اُسے صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اب یہ بات منشائے خداوندی کے خلاف ہوگی کہ اُسے ایک خاص راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کو مخاطب کرکے فرمایا۔ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اگر تمہارے خدا کے پروگرام میں یہ ہوتا کہ انسان کو ایمان کے راستے پر مجبور چلایا جائے تو اس کے لئے ایسا کرنا کیا مشکل تھا؟ وہ انسانوں کو پیدا ہی ایسے کرتا کہ وہ سب کے سب، آنکھ بند کئے، بھیڑ بکریوں کی طرح، اس راستے پر چلے جاتے۔ لیکن اس نے انسان کو ایسا پیدا نہیں کیا۔ اسے اس باب میں اختیار دیا گیا ہے۔ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ (۱۰/۹۹) تو کیا تو انہیں مجبور کرے گا کہ وہ بالضرور ایمان لے آئیں؟ یہ تو مشیتِ خداوندی کے خلاف ہوگا۔ اس لئے تیرا کام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو ان لوگوں تک پہنچائے جا۔ اس سے زیادہ کا تو مکلّف نہیں۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (۲/۲۵۶)

غلط اور صحیح راستہ (اس قرآن کے ذریعے) متمیز ہو کر سامنے آچکا ہے۔ اس کے بعد دین کے معاملہ میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک مذہب نہیں (مذہب کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا) اس لئے وہ مذاہبِ عالم میں سے کسی کو اپنا حریف نہیں قرار دیتا۔ وہ ایک دین، یعنی ضابطۂ زندگی یا نظامِ حیات ہے۔ وہ اس کی اجازت تو نہیں دے سکتا کہ اس کی حدودِ مملکت میں رہنے والے کوئی دوسرا نظامِ مملکت قائم کریں ــــ یہ تو "ریاست درونِ ریاست" (STATE WITHIN A STATE) قائم کرنے کے مرادف ہوگا جس کی کہیں بھی اجازت نہیں مل سکتی۔ لیکن وہ اس سے کچھ تعرض نہیں کرتا کہ اس کے حدودِ مملکت میں رہنے والے اپنے لئے مذہب کونسا پسند کرتے ہیں ــــ اتنا ہی نہیں کہ وہ ہر ایک کو مذہبی آزادی عطا کرتا ہے۔ وہ جہاں اپنے نظام کے مراکز، یعنی مساجد کی حفاظت کرتا ہے، وہاں، تمام اہلِ مذاہب کی پرستش گاہوں کی بھی

حفاظت اپنے ذمے لیتا ہے۔ وہ اسلامی مملکت کے وجود کی ایک وجۂ جواز یہ بھی بتاتا ہے کہ :-

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا۔ (۲۲/۴۰)

اگر اللہ انسانوں کے ذریعے، سرکش قوتوں کی روک تھام کا انتظام نہ کرتا تو یقیناً راہبوں کی خانقاہیں۔ عیسائیوں کے گرجے۔ دیگر اقوام کی پرستش گاہیں اور مسجدیں جن میں بکثرت خدا کا نام لیا جاتا ہے۔ ڈھا دی جاتیں۔ (لہٰذا، ان تمام معبدوں کی حفاظت، قرآنی مملکت کی ذمہ داری ہے، جس کا ہر غیر مسلم بطورِ اپنے حق، کے مطالبہ کر سکتا ہے)۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے جماعتِ مومنین سے تاکیداً کہا ہے کہ، وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ تم، غیر مسلموں کے معبودوں کو گالی مت دو۔ تم ایسا کرو گے تو وہ، اس کے مقابلہ میں بربنائے جہالت، اللہ کو گالی دے دیں گے۔ سو جس طرح تمہیں یہ بُرا لگے گا، اسی طرح، ان کے معبودوں کو تمہارا گالی دینا بھی بُرا لگتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ: كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ۔ (۶/۱۰۹) ہر ایک کو اپنا اپنا مسلک اور اپنا اپنا معبود پسند ہوتا ہے۔ تم ان تک حق کی بات پہنچاؤ۔ جب یہ، بربنائے علم و بصیرت غلط اور صحیح میں تمیز کرنے کے قابل ہو جائیں گے، تو خود بخود، اپنے معبودانِ باطل کو چھوڑ کر، صحیح نظامِ زندگی اختیار کر لیں گے۔

لہٰذا، اسلامی نظام نوعِ انسان کو، مذہبی آزادی کا حق ہی نہیں دیتا بلکہ اس کی بھی ضمانت دیتا ہے کہ کوئی ان کے معبودوں کے خلاف زبان درازی یا ان کی شان میں گستاخی نہ کرے۔

غیر مسلموں کی پوزیشن

اسلامی نظام کے تحت رہنے والوں کو مذہبی آزادی تو حاصل ہوگی لیکن انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جائے گا۔ عصرِ حاضر میں قومیت کی تشکیل، وطن یا نسل کے اشتراک سے کی جاتی ہے۔ بالخصوص وطن کے اشتراک سے۔ یعنی ایک ملک کے بسنے والے تمام افراد، بلاتمیز مذہب ایک قوم بن جاتے ہیں۔ لیکن اسلامی نظام میں، قوم کی تشکیل، آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ یعنی جو لوگ اسلامی آئیڈیالوجی کو تسلیم کریں وہ ایک قوم کے افراد، اور جو لوگ اس آئیڈیالوجی پر ایمان نہ رکھیں، وہ اس قوم کے دائرے سے باہر، خواہ وہ اسی ملک میں کیوں نہ بستے ہوں۔ قرآن کریم نے نوعِ انسان کی تفریق اسی معیار کے مطابق کی ہے۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ۔ (۶۴/۲) اللہ وہ ہے جس نے تم (تمام انسانوں کو) پیدا کیا۔ سو تم میں سے کچھ کافر ہیں اور کچھ مومن، وہ اپنی آئیڈیالوجی کی دعوت کو عام کرتا ہے۔ یعنی وہ اس دعوت کو دنیا کے تمام انسانوں کے سامنے بلا لحاظ رنگ، نسل، وطن، زبان، مذہب یکساں طور پر پیش کرتا ہے اور ان سے کہہ دیتا ہے کہ وہ اس آئیڈیالوجی پر خود غور و فکر کریں اور اس کے بعد،

اگر علیٰ وجہ البصیرت اور بطیب خاطر (یعنی دل اور دماغ کی رضامندی سے) سمجھیں گے کہ یہ آئیڈیالوجی ان کے لئے قابلِ قبول ہے۔ تو اسے قبول کر لیں اور اگر ایسا نہ سمجھیں تو اسے مسترد کر دیں۔

اس سے قرآن کریم نے اسلامی ملت میں شامل ہونے اور اسلامی مملکت میں شریک کار بننے کے لئے دروازہ کھلا رکھا ہے کہ جس کا جی چاہے اس کے اندر داخل ہو جائے۔ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا۔ (۷۳/۱۹) "جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے۔" اس "اذنِ عام" کے بعد اگر کوئی شخص اس کے اندر آنا نہیں چاہتا تو وہ اپنے عمل کا آپ ذمہ دار ہے۔ سورۂ فاطر میں اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ: هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ۔ "اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں حکومت عطا کی ہے۔" فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ۔ اگر کوئی شخص اس آئین و دستور کو نہیں مانتا جس پر اس حکومت کی عمارت استوار ہے تو اس کے لئے وہ خود ذمہ دار ہے۔ اس آئینِ مملکت (اسلامی آئیڈیالوجی) کو تسلیم نہ کرنے سے اگر وہ کسی قسم کے مفاد سے محروم رہتا ہے تو اسے اس کی شکایت نہیں کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ خود کردہ را علاجے نیست۔ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کسی آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کرے لیکن اُسے تسلیم کرنے والوں کو جو مفاد حاصل ہیں ان میں برابر کا شریک ہونا چاہے۔ (واضح رہے کہ یہ مفاد ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا فطری نتیجہ ہوتے ہیں جو اسلامی نظام کی حامل جماعت پر عائد ہوتی ہیں)۔ لہٰذا، اگر اس کے انکار سے اسے کچھ نقصان پہنچتا ہے تو اسے اس نقصان کو برداشت کرنا ہوگا۔ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ إِلَّا مَقْتًا۔ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَارًا۔ (۳۵/۳۹) اس انکار سے انہیں خیر و برکت کے جو دروازے اپنے اوپر بند کئے ہیں، اس کے نقصان کے وہ خود ذمہ دار ہیں۔ وہ جس وقت بھی اپنی غلطی کو محسوس کریں، اس کا ازالہ کر لیں، اس آئیڈیالوجی کو تسلیم کر لیں، اور بلا روک ٹوک اس کے اندر داخل ہو جائیں۔

انہیں شریکِ راز نہیں کیا جا سکتا

لہٰذا اسلامی مملکت میں بسنے والوں میں سے جو لوگ اسلامی آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کریں، انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جا سکتا۔ اس باب میں قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر اس شرح و بسط سے وضاحت کر دی ہے کہ اسے سمجھنے میں کسی قسم کی دقت پیش نہیں آ سکتی۔ شریکِ حکومت کرنا تو ایک طرف، وہ انہیں شریکِ راز بھی نہیں کر سکتا۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا ..... إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ۔ (۳/۱۱۸)

اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ وہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھیں گے۔ جس بات سے تمہیں نقصان اور مصیبت پہنچے وہ اسے دل سے پسند کرتے ہیں۔ ان کے

سینے کے اندر چھپے ہوئے جذباتِ بغض و عناد میں سے بعض اوقات کچھ (بے اختیار) ان کی زبان سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو ان کے سینے کے اندر چھپے رہتے ہیں وہ ان ظاہر ہو جانے والوں کے مقابلہ میں کہیں بڑھ کر ہیں۔ ہم نے تمام باتیں اچھی طرح واضح کر دی ہیں۔ اگر تم عقل و فکر سے کام لو گے (تو ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی۔)

ذرا سوچو تو سہی! کیا تم ان لوگوں سے محبت کرو گے جو تم سے کبھی محبت نہیں کرتے۔ حالانکہ تم (اپنی اور ان کی تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔ جب یہ لوگ تم سے ملنے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی (تمہارے آئین و دستور کو) صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ اور جب علیحدہ ہوتے ہیں تو غصے کے مارے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ ان سے کہو کہ جاؤ! اپنے غصے (کی آگ میں) جل مرو۔ اللہ تمہارے سینوں کے اندر چھپے ہوئے جذبات تک سے واقف ہے۔ اگر تمہاری حالت بہتر ہو جائے تو یہ چیز انہیں سخت ناگوار گذرتی ہے اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو یہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ یاد رکھو! اگر تم استقامت سے رہو گے اور مخالفین سے اپنی حفاظت کا سامان کرتے رہو گے تو ان کی کوئی سازش تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ اللہ ان کے تمام اعمال کو محیط ہے۔

قرآنِ کریم میں اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں۔ (مثلاً ۳/۱۱۷ و ۶۰/۱-۴ و ۹/۲۳-۲۴ وغیرہ)

یہ تنگ نظری نہیں

حیرت ہے کہ بعض حلقوں میں اس نظریہ کو قابلِ اعتراض سمجھا جاتا ہے اور اسے "تنگ نظری" پر محمول کیا جاتا حالانکہ کوئی نظام جو آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر استوار ہو، ان لوگوں کو کبھی شریکِ حکومت نہیں کر سکتا جو اس آئیڈیالوجی کے مخالف ہوں۔ اسلامی مملکت کا آئین درحقیقت اس کی آئیڈیالوجی ہوتا ہے۔ جو لوگ اس آئیڈیالوجی کو نہیں مانتے وہ اس مملکت کے آئین کو تسلیم نہیں کرتے۔ اب سوچئے کہ دنیا میں کوئی مملکت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو ان لوگوں کو شریکِ حکومت کرے جو اس کے آئین کو تسلیم نہ کریں؟ کیا یہ عجیب بات نہ ہو گی کہ اسلامی مملکت کا مقصد اور نصب العین تو قوانینِ خداوندی کی عملاً "تنفیذ" ہو اور اس مقصد کے حصول میں ان لوگوں شریک کر لیا جائے جو خود اس مقصد ہی کے خلاف ہوں؟

غیر مسلموں سے حسنِ سلوک

لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں کوئی حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔ انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جنہیں قرآنِ کریم انسانوں کے لئے بنیادی حقوق قرار دیتا ہے۔ ان کی جان، مال، عزت، عبادت گاہیں سب محفوظ ہوں گی۔ انہیں شخصی مذہب کی آزادی ہو گی ان سے حسنِ سلوک کیا جائے گا (۶۰/۸) ان سے ہر حال میں عدل کیا جائے گا۔ (۵/۸)

☆

مشاورتی نظام

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ اسلامی نظام میں، نظم و نسق مملکت کی تمام ذمہ داریاں، اُمتِ مسلمہ سرانجام دے گی۔ اور وہ انہیں سرانجام دے گی باہمی مشاورت سے۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ (۴۲/۳۸) قرآن کا بنیادی اصول ہے۔

واضح رہے کہ امورِ مملکت کے بارے میں قرآن اصولی راہ نمائی دیتا ہے۔ ان اصولوں کی جزئیات خود متعین نہیں کرتا۔ اس لئے اس نے یہ تو کہہ دیا کہ امورِ مملکت باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔ لیکن اس مشاورت کی مشینری خود متعین نہیں کی۔ اسے اُمّت پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، خود تجویز کرے کہ اس مشاورت کے لئے عملی اسکیم کونسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اس اعتبار سے یہ نظام "جمہوریۂ شورائیہ" کہلا سکے گا، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جمہور کو جملہ اختیارات، قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے حاصل ہوں گے۔ وہ نہ تو ان حدود میں کمی بیشی کر سکیں گے اور نہ ان سے تجاوز۔ اس میں "تھیاکریسی" کا شائبہ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اس مملکت میں کسی کو خدائی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے۔ یہ صرف احکامِ خداوندی کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔

پارٹی سسٹم قرآنِ کریم کی رُو سے پوری کی پوری اُمّت ایک پارٹی ہے۔ اس کے اندر پارٹیوں کا وجود (خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو یا سیاسی پارٹیوں کے پیکر میں) شرک ہے۔ سورۂ روم ہے۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۚ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۱-۳۲)۔ (مسلمانو! دیکھنا ـــ تم خدائے واحد پر ایمان لا کر پھر سے کہیں) مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور فرقوں (پارٹیوں) میں تقسیم ہو گئے۔ پھر ہر فرقہ (پارٹی) اپنے اپنے مسلک و منشور پر اترا رہی ہے۔" دوسرے مقام پر رسول اللہ سے کہا گیا کہ: إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ـــ لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ..... (۶/۱۶۰) "وہ لوگ جو اپنے دین میں فرقے پیدا کر لیں اور خود بھی ایک فرقہ یا پارٹی بن جائیں، اے رسول! تمہیں ان سے کوئی سروکار نہیں۔" وحدتِ اُمّت دین کا بنیادی تقاضا ہے۔ خدا کا حکم یہ ہے کہ:۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ..... (۳/۱۰۳)

تم سب کے سب، مل کر "حبل اللہ" ـــ کتابِ خداوندی ـــ کو مضبوطی سے تھامے رہو۔

اور مذہبی فرقوں یا سیاسی پارٹیوں میں مت تقسیم ہو جاؤ۔

فرقوں اور پارٹیوں سے اختلاف پیدا ہوتا ہے، اور اختلاف خدا کا عذاب ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۔ (۳/۱۰۴)

(مسلمانو!) تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو پارٹیوں میں بٹ گئے اور (خدا کی طرف سے) واضح احکام آ جانے کے بعد، باہمی اختلاف کرنے لگ گئے۔ ان لوگوں کے لئے سخت عذاب ہے۔

اختلافات کا مٹ جانا، خدا کی رحمت ہے۔ وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ۝ إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ ..... (۱۱/۱۱۸) "لوگ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے بجز ان کے جن پر تیرے رب کی رحمت ہو۔"

اس مملکت میں تمام افرادِ اُمت ایک دوسرے کو حق و استقامت کی تلقین کریں گے۔ (وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ ۱۰۳/۳) - اور "بر و تقویٰ" کے کارناموں میں سب ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ (وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۵/۲)

بنابریں، مغرب کا جمہوری نظام جس میں قانون سازی کے غیر محدود اختیارات مجلسِ قانون ساز کو حاصل ہوتے ہیں، اسلامی نظام کی نقیض ہے اور حزب بندی اور اختلاف کی تفریق، خدا کا عذاب۔

عالمگیر برادری

اسلامی مملکت ابتداءً ایک خاص خطۂ زمین میں داخل ہوتی ہے تاکہ یہ کرۂ ارض، قوانینِ خداوندی کی عملاً نتیجہ خیزی کے لئے تجربہ گاہ بن سکے۔ اس تجربہ سے جو خوشگوار اور انسانیت ساز نتائج مرتب ہوتے ہیں، وہ اس خطۂ زمین تک محدود نہیں رہتے۔ ان کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ نظام، پوری انسانیت کے لئے آیۂ رحمت ہے۔ اس کا مقصدِ عظیم تمام نوعِ انسان کے باہمی اختلافات مٹا کر اسے ایک عالمگیر برادری بنانا ہے۔ خدا کی طرف سے سلسلۂ رشد و ہدایت کی غرض و غایت یہی تھی۔ اور یہی اب قرآن کا مقصود ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ... (۲/۲۱۳)

تمام انسان (درحقیقت) ایک برادری کے افراد ہیں۔ (لیکن یہ آپس میں اختلاف کرنے کی وجہ سے مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ ۱۰/۱۹) سو اللہ نے انبیاء کو مبعوث کیا جو انہیں غلط راستوں کی تباہیوں سے آگاہ کرنے والے اور صحیح راستے کی خوشگواری کی خوشخبری دینے والے تھے۔ اور ان کے ساتھ اللہ نے حق کے ساتھ ضابطۂ قوانین بھی بھیجا تاکہ وہ لوگوں کے اختلافی معاملات میں (حق و صداقت کے ساتھ) فیصلہ کرے (اور اس طرح انہیں پھر سے اُمتِ واحدہ بنا دے)۔

نظامِ عدل و امن

اسلامی نظام کے قیام کا مقصد، ساری دنیا میں عدل کا قیام ہے۔ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (۵۷/۲۵) "تاکہ نوعِ انسان انصاف پر قائم رہے"۔ اور قیامِ امن بھی۔ (وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔ ۲/۶۰ دنیا میں فساد پھیلاتے ہوئے حد سے نہ بڑھو) جو جماعت ——— اس مملکت کے قیام کا باعث بنتی ہے، اسے جماعتِ مومنین کہا گیا ہے، جس کے معنی ہیں وہ جماعت جو دنیا میں قیامِ امن کی ضامن ہو۔ اس نظام کے دوام و استمرار کے لئے یہ اصول بتایا گیا کہ:-

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔ (۱۳/۱۷)

اور جو چیز تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہوتی ہے اسے ہی دنیا میں بقا نصیب ہوتی ہے۔

ربوبیتِ عالمینی

اسی لئے "ربوبیتِ عالمینی" ——— تمام نوعِ انسان کی نشوونما ——— اسلامی نظام کا مقصود بتایا گیا۔ (۱/۲) ان مقاصد کے حصول کے لئے دنیا کی جو قومیں کسی قسم

کی کوشش کریں گی، یہ مملکت ان سے تعاون کرے گی۔ اس کے خلاف اقدامات میں کسی سے تعاون نہیں کرے گی۔ (وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۵/۲)۔ یہ مملکت اپنے تجربہ کے درخشندہ نتائج کی روشنی میں، ان مقاصد کو عام کرتی جائے گی۔ تا آنکہ۔

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا۔ (۳۹/۶۹)

زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔

عدل مذکورہ بالا شق میں، عدل کا ذکر ضمناً آیا ہے۔ لیکن عدل تو اسلامی نظام کی اصل و بنیاد ہے۔ اس لئے قدرے تفصیل کا متقاضی۔ عدل کی ایک شکل یہ ہے کہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قانون کے مطابق کیا جائے اور اس میں کسی کی رو رعایت نہ کی جائے۔ اس نظام میں ہر صاحبِ اختیار سے کہا جاتا ہے کہ ـــــ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ۔ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ۔ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى۔ (۳۸/۲۶) تمہیں مملکت میں صاحبِ اختیار اس لئے بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں کے فیصلے حق کے ساتھ کرو اور اس میں اپنے جذبات کو کبھی دخیل نہ ہونے دو۔

یہاں، کہا گیا ہے کہ لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ حق کے ساتھ کرو۔ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ عدل کا عام تصور یہی ہے کہ اگر معاملات کا تصفیہ ملک کے رائج الوقت قانون کے مطابق ہو تو کہا جائے گا کہ عدل کا تقاضا پورا ہو گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود وہ قانون، جس کے مطابق فیصلہ ہوا ہے، عدل پر مبنی نہیں تو اس کے مطابق فیصلہ کو مبنی بر عدل کیسے کہا جائے گا؟ اگر قانون کے استعمال میں جذبات اثر انداز ہو سکتے ہیں تو قانون سازی میں جذبات کیوں اثر انداز نہیں ہو سکتے! یہ وجہ ہے کہ قرآنی نظام میں قانون سازی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں تمام قوانین، اصولی طور پر، خدا کے متعین فرمودہ (قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ) ہوتے ہیں۔ اور مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ العمل بنائے۔ اسی سے وہ مملکت اسلامی بنتی ہے۔ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴)

جو خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہٰذا قرآنی مملکت میں ہر فیصلہ قرآنی قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی کو عدل کہا جاتا ہے۔ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ۔ (۷/۱۵۹) ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں، نہ فیصلہ کرنے والے کے ذاتی رجحانات و میلانات اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے خارجی مؤثرات دخیل کار:

يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ

وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔ (۲/۴۸)

اُس روز میں کوئی شخص (قانون کے مقابلہ میں) کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آسکے گا۔ نہ ہی کسی کی سفارش مجرم کو بچا سکے گی، نہ ہی اس سے کچھ لے کر اُسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی کوئی کسی اور طرح مجرم کی مدد کر سکے گا۔

اس میں مجرم چھپا نہیں رہ سکتا، دور سے پہچانا جا سکتا ہے۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ۔ (۵۵/۴۱) — "اس میں مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے" — اس میں انتظام ایسا ہوتا ہے کہ مجرم، شریف انسانوں سے بالکل الگ نظر آئیں — وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ۔ (۳۶/۵۹) تاکہ کوئی، ایسے لوگوں سے دھوکا نہ کھا سکے۔ اس میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مجرم، مواخذہ سے بچ جائے یا کوئی بے گناہ یونہی دھر لیا جائے — لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا (۶/۱۶۵) ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پاتا ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔ (۶/۱۶۵)

اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

قرآنی مملکت میں، بڑی سے بڑی شخصیت بھی قانون کے دائرے سے باہر یا بالا نہیں ہوتی۔ اس باب میں اور تو اور، خود حضور رسالتمآبؐ کی زبانِ اقدس سے یہ اعلان ہوتا ہے کہ:-

اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۶/۱۵)

اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے ڈرتا ہوں۔

حضورؐ نے فرمایا کہ اگر میری چہیتی بیٹی — فاطمہؓ — بھی قانون شکنی کرے تو میں اسے بھی سخت سزا دوں گا۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ مصر کے گورنر نے، ان کے بیٹے کو وہ سزا جو پبلک کے سامنے دینی چاہیئے تھی، پرائیویٹ مکان میں دی ہے، تو آپ نے بیٹے کو مدینہ بلوا کر، اسے از سرِ نو پبلک میں سزا دی — جب اسی مصر کے گورنر کے بیٹے نے ایک مصری کو کسی بات پر یہ کہہ کر ہنٹر سے پیٹا کہ تم بڑے آدمیوں کی اولاد سے گستاخی سے پیش آتے ہو، تو آپ نے، گورنر، اس کے بیٹے، اور اس مصری کو مدینہ بلوا بھیجا۔ مصری کے ہاتھ میں ہنٹر دیا اور کہا کہ اسے اُسی طرح مارو اور کہو کہ تم نے دیکھ لیا کہ بڑوں کی اولاد کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اس گورنر کو بھی تادیب کی کہ اگر تم نے بیٹے کی تربیت صحیح کی ہوتی تو اس کے سر میں یہ خناس کیوں سماتا کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے اس لئے اُسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حق حاصل ہے۔ خود امیرالمؤمنین حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ ایک عدالت میں پیش ہونے کا اتفاق ہوا تو جج نے انہیں امتیازی مقام پر بیٹھنے کی پیش کش کی، آپ نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا اور مدعی کے برابر بیٹھ گئے۔ مقدمہ ختم ہونے کے بعد، آپ نے جج کو لکھا کہ تم جج بننے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک تم امیرالمؤمنین اور ایک عام شہری کو یکساں نہ سمجھو۔

قرآنی مملکت میں یہ کیفیت تو عدالت کی ہوتی ہے۔ لیکن جس نفسیاتی تبدیلی کا شروع میں ذکر کیا گیا ہے

اس کی رو سے اس میں افرادِ معاشرہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر ان سے کبھی کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو وہ خود اپنے آپ کو اپنے جرم کی سزا کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ ارتکابِ جرم کا کوئی شاہد ہو یا نہ ہو، خود خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل سب سے بڑا گواہ ہوتا ہے۔ وہ گواہ جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:-

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ۔ (۴۰/۱۹)

وہ نگاہ کی خیانت اور دل کے اندر گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔

پہل کہاں سے ہو؟

لیکن افرادِ معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب پہلے برسرِ اقتدار طبقہ خود اپنے کیریکٹر میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ اس میں اقتدار و اختیار کی امانت انہیں لوگوں کے سپرد کی جاتی ہے جن میں اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو چکی ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ لوگ قانون کی اطاعت کرتے ہی اس وقت ہیں جب ان کے ارباب حل و عقد خود قانون کی اطاعت کریں۔ اسی طبقہ کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے ساری قوم سنور جاتی ہے۔ جب حضرت صالحؑ کو قومِ ثمود کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا تو آپ نے دیکھا کہ قوم تمام کی تمام بگڑی ہوئی ہے، اس کی اصلاح کی صورت کیا ہوگی؟ تو خدا کی طرف سے جواب ملا کہ گھبرانے کی بات کوئی نہیں ـــــ وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ۔ (۲۷/۴۸) مملکت کے مرکز میں قوم کے نو سرغنے ہیں اور وہی سارے فساد کا موجب ہیں اور قوم کے معاملات کو سنورنے نہیں دیتے۔ اگر وہ راہِ راست پر آ جائیں تو ساری قوم سنور جائے گی۔ یہی تھی وہ حقیقت جسے حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:-

> عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کے لیڈر سیدھے رہتے ہیں۔ جب تک راعی، اللہ کی راہ میں چلتا ہے، رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ جہاں اس نے پاؤں پھیلائے رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔

سوشل جسٹس

یہ تھا عدل ـــــ یعنے قانون کے مطابق چلنے، کا ایک گوشہ ـــــ اس کا دوسرا گوشہ ہے جسے آجکل کی اصطلاح میں عدلِ عمرانی (SOCIAL JUSTICE) کہا جاتا ہے۔ سوشل جسٹس کی اصطلاح آجکل بڑی عام ہو رہی ہے اور اس کا ہر جگہ چرچا سنائی دیتا ہے۔ لیکن اس اصطلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق ابھی تک متفق علیہ کچھ نہیں کہا گیا۔ یہ اصطلاح بھی، سوشلزم کی طرح، ہر ذہن میں الگ مفہوم کی حامل ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سوسائٹی کو مبنی بر عدل (JUST) کہا جائے گا جس میں ہر فرد کو وہ کچھ مل جائے جس کا وہ حقدار ہے۔ لیکن یہیں سے پھر دوسرا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کس طرح متعین کیا جائے کہ کوئی شخص کسی چیز کا حقدار ہے ـــــ مختلف افراد کے حق (یا واجبات ـــــ DUES) کا تعین، پہلے سوال سے بھی زیادہ مشکل ہے اور اسی سے ساری

پیچیدگیاں اُبھرتی ہیں۔ ایک طرف سے جواب ملتا ہے کہ ایک شخص صرف اس کا حقدار ہے جو اسے معقولی اخلاقی اصولوں (VALID MORAL PRINCIPLES) کے مطابق ملے۔ لیکن یہ اخلاقی اصول کیا ہیں؟ یہ سوال پھر بحث طلب رہ جاتا ہے۔ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت تک میری نظروں سے گذرا ہے، اس میں (EMIL BRUNNER) کا پیش کردہ مفہوم قرآنی تصور کے مطابق ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی برعدل (JUST) اور فلاں ظلم پر مبنی (UNJUST) ہے، وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماورا ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق الوہیاتی معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا۔ جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی بناکاری اور ملمع سازی ہوگی۔ (JUSTICE AND THE SOCIAL ORDER)

اور یہ معیار، قرآنِ کریم کے سوا، کچھ نہیں ہو سکتا ـــــ ہمارے لئے ہی نہیں، ساری دنیا کے لئے۔ کیونکہ دنیا میں خداوندی فیصلوں کا ضابطہ اور کسی کے پاس نہیں۔

اس کی ضمانت کیا؟

آخر میں، ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں جو اکثر پوچھا جاتا ہے کہ اس کی ضمانت کیا ہے کہ جو افرادِ امت، اسلامی نظام کے قیام و استحکام کے ذمہ دار ہوں گے وہ ان اصولوں سے برگشتہ نہیں ہو جائیں گے۔ ضمانت تو اس کی کوئی بھی نہیں دے سکتا، لیکن اس کیلئے قرآنِ کریم جو نظام تجویز کرتا ہے اس سے اس کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں۔ اس نظام کی رو سے:۔

(۱) ہر نسل کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جاتی ہے کہ ان میں وہ نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جائے جو اس امت کی تعمیر و تشکیل کی خشتِ اوّل ہے۔ یعنی اس میں ایسا انتظام ہوتا ہے کہ افرادِ اُمت کے قلب و دماغ شروع ہی سے اقدارِ خداوندی کے قالب میں ڈھلے ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ پیہم جاری رہتا ہے۔

(۲) اس میں نظم و نسق کی امانت ان افراد کے سپرد کی جاتی ہے جو ان اقدار کے سب سے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔

(۳) افرادِ اُمت کا مسلک تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ (۱۰۳/۳) ہوتا ہے۔ یعنی وہ ایک دوسرے کا احتساب کرتے رہتے ہیں کہ وہ جادۂ حق و استقامت پر گامزن ہیں یا نہیں۔

(۴) اس اُمت کا نظام اس طرح تجویز کیا گیا ہے: لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۲/۱۴۳) یہ اُمت، جملہ اقوامِ عالم کے اعمال کی نگران ہوگی اور ان کا رسُول ان کے اعمال کا نگران۔ رسول اللہؐ کی نگہ احتساب اس امر کی کافی ضمانت تھی کہ افرادِ

اُمّت کا قدم جادۂ حق و صداقت سے ذرا اِدھر اُدھر نہ ہونے پائے۔ سوال، رسول اللہؐ کی دنیا سے تشریف براری کے بعد کا ہے۔ اس وقت اس نگرانی کا فریضہ رسول اللہؐ کے جانشین ادا کریں گے۔ اس کو خلافتِ راشدہ، یا مرکزِ ملّت کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جب تک یہ سلسلہ اسی انداز سے جاری و ساری رہے، اسلامی نظام قائم رہتا ہے۔ اگر یہ باقی نہ رہے تو اسلامی نظام بھی باقی نہیں رہتا۔ پھر یہ اُمّت بھی عام اقوامِ عالم کی سطح پر آ جاتی ہے، اور جس جہنم کے عذاب میں دوسری قومیں گرفتار ہوتی ہیں، یہ بھی اسی میں ماخوذ ہو جاتی ہے ——— بلکہ ان سے بھی شدید تر عذاب میں ——— جیسی کہ آج ہماری حالت ہے۔

لیکن اس میں ہمارے لئے امید کی کرن یہ ہے کہ ہم اگر چاہیں تو یہ نظام پھر سے قائم ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد، قرآن کریم ہمارے پاس محفوظ ہے۔

لیکن یہ نہ تو مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ سے قائم ہو سکتا ہے، اور نہ ہی مغربی اندازِ سیاست کے لیڈروں کے ہاتھ سے۔ اس لئے کہ، جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، یہ نظام مذہبی پیشوائیت اور مغربی اندازِ سیاست (جو درحقیقت ملوکیت ہی کا ایک جدید اور مزیّن ایڈیشن ہے) دونوں کو مٹانے کے لئے آتا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ اس نظام میں جن عناصر کی موت ہو، کیا وہ اس نظام کو قائم کرنا چاہیں گے؟ وہ تو اس کی شدید ترین مخالفت کریں گے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر واضح کہا ہے کہ جب اور جہاں بھی اس نظام کی آواز بلند ہوئی، مذہبی پیشوائیت کی طرف سے سب سے پہلے اس کی مخالفت ہوئی۔ ان کی دلیل یہ ہوتی تھی کہ: إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّهْتَدُونَ۔ (۴۳/۲۲) ہم اِس نئے نظام کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اُسی مسلک پر چلتے رہنا چاہتے ہیں جو ہمارے اسلاف سے ہم میں متوارث چلا آ رہا ہے۔ ہم انہی کے نقوشِ قدم کا اتباع کریں گے۔ ہم اپنی روایاتِ کہنہ کو نہیں چھوڑنا چاہتے۔ اُن سے، اس کے جواب میں کہا جاتا کہ: أَوَلَوْ جِئْتُكُم بِأَهْدَىٰ مِمَّا وَجَدتُّمْ عَلَيْهِ آبَاءَكُمْ۔ (۴۳/۲۴) جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا گیا ہے اگر یہ اُس سے بہتر ہو جس پر تم اپنے آباؤ و اجداد کی تقلید میں چلے جا رہے ہو، تو کیا تم پھر بھی اپنے اسلاف کے مسلک ہی کو ترجیح دو گے؟ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں! ہم اُسی مسلک کا اتباع کریں گے۔ ہمیں کسی نظامِ نو کی ضرورت نہیں۔ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا۔ (۵/۱۰۴) ——— وہ مسلک ہمارے لئے ہر اعتبار سے کافی ہے! ——— آپ سوچئے کہ جن لوگوں کا یہ مسلک اور مذہب ہو، کیا ان کے ہاتھوں اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے؟

اسلامی نظام کے قیام کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ان تمام نظریاتِ حیات و تصوراتِ زندگی، اِن تمام روایاتِ کہنہ اور مسالکِ قدیمہ کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھا جائے جو قوم میں متوارث چلے آ رہے ہیں۔ اس مملکت کا بنیادی پتھر ——— لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه ——— ہے۔ اس میں لَا إِلٰهَ کے معنی یہ ہیں کہ تمام متوارث تصورات کو الگ کر کے، ہر شے کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے۔ اس کے بغیر، اس جدید نظام کی عمارت (جس کی بنیاد إِلَّا اللّٰه پر استوار ہوتی ہے) قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ؎

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند — اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

اسلام میں "بت پرستی" کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بُت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لئے اوثان کا لفظ آیا ہے جو وثن کی جمع ہے۔ اور وثن کے معنی ہوتے ہیں جمود و تعطل، عدمِ حرکت، جامد و غیر متحرک ہو جانا۔ اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصور یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے۔ وثن ہے۔ جب قرآنی ضابطۂ حیات کو عملی شکل دے دی جائے تو اس سے ایک ایسا نظام وجود میں آتا ہے جو حرکتِ پیہم اور سعیٔ مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ "حرکتِ پیہم" کے معنی یہ ہیں کہ وہ نظام، قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانہ کے بدلتے اور بڑھتے رہنے والے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (DYNAMIC MOVEMENT) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رک جائے اس میں جمود پیدا ہو جائے تو یہ وثنیت ہو گی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ حیرت ہے کہ ہم نے قرآن کے اس عظیم نکتہ کو پسِ پشت ڈال دیا اور مغرب کے مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ چنانچہ "وائٹ ہیڈ" لکھتا ہے کہ:۔

> بت پرستی کی کنہ و حقیقت مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا ہے۔ ؎۱

اس قسم کی بت پرستی میں، ایک زندہ اور متحرک نظامِ حیات کے مظاہر و مناسک کی محض شکلیں باقی رہ جاتی ہیں، ان کے مقاصد و مطالب ختم ہو جاتے ہیں۔ مذہب 'دین کی ممی شدہ لاش' ہوتا ہے۔ ان بے روح رسوم اور بے جان معتقدات سے چپکے رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق وائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ:۔

> زندگی کے بے جان پیکروں کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ سست رفتار زوال ہوتا ہے جس میں ان رسوم کو بلا نتیجہ دہرایا جاتا ہے...... اس سے تہذیب و ترقی کا محض سراب باقی رہ جاتا ہے۔ حقیقت غائب ہو جاتی ہے۔ ؎۲

یہ ہیں نظامِ اسلام یا نظامِ مصطفٰے (صلے اللہ علیہ وسلم) کے وہ اُبھرے ہوئے نقوش جنہیں میں نے نہایت مختصر الفاظ میں پیش کیا ہے — ان کی تفصیل کے لئے ضخیم مجلدات کی ضرورت ہو گی — اور اگر آپ اسے، اس سے بھی مختصر الفاظ میں سمجھنا چاہیں تو یہ کہہ لیجئے کہ یہ وہ نظام ہو گا جو پکار پکار کر کہے گا کہ:۔

کس دریں جا سائل و محروم نیست   عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اس میں نہ کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو گا، نہ ان کے حصول کے لئے کسی کا محتاج۔ اس میں نہ کوئی آقا ہو گا، نہ غلام۔ نہ کوئی حاکم ہو گا نہ محکوم۔ نظامِ مصطفٰےؐ علیٰ حدِ بشریت، صفاتِ خداوندی کا مظہر ہوتا ہے۔

کہئے کہ دنیا کا کوئی اور نظام اس کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ اسی لئے کہا گیا ہے کہ: وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ۔ (۳/۸۵) "جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور نظام کا خواہاں ہو گا، وہ نظام قابلِ قبول نہیں ہو گا۔ اس لئے کہ وہ کائنات میں فٹ ہی نہیں بیٹھ سکے گا۔

والسلام

؎۱ A. N. WHITEHEAD - ADVENTURE OF IDEAS - P.12

؎۲ " " " " " " " P.358

جرم اور سزا

ملک کے حالیہ ہنگاموں میں 'اسلامی نظام' کے ضمن میں، شرعی سزاؤں کا ذکر بار بار آتا رہا۔ اس سلسلہ میں ہمیں اپنے اکثر قارئین کی طرف سے استفسارات موصول ہوئے ہیں کہ قرآنِ کریم کی رو سے، جرم اور سزا کا باہمی تعلق کیا ہے اور اس کا فلسفہ کیا؟ کچھ سال اُدھر کا ذکر ہے کہ ادارہ میں قرآنی احباب کی ایک نجی سی محفل منعقد ہوا کرتی تھی جس میں پرویز صاحب، ان احباب کے سوالات کا جواب دیتے تھے۔ انہی نشستوں میں ایک دن جرم اور سزا کے فلسفہ سے متعلق بھی ایک سوال سامنے آ گیا۔ پرویز صاحب نے اس کا جو جواب دیا، ہم سمجھتے ہیں کہ وہ موجودہ استفسارات کے حوالے سے بھی بڑا مناسب اور مفید ہے۔ اس لئے اسے باونے لفظی تغیر درج ذیل کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس میں صرف ایک اصولی بحث کی گئی ہے۔ تفصیلی نہیں۔ نہ ہی اس نکتہ کو چھیڑا گیا ہے کہ محض سزاؤں کے نفاذ سے کوئی نظام، اسلامی نہیں بن جاتا۔ یہ نکتہ پرویز صاحب کے الگ زیرِ غور ہے۔

قرآنِ کریم میں دو قسم کے احکام ملیں گے ——— ایک اخلاقی اور دوسرے تعزیری۔ تعزیری سے مراد ہیں ایسے احکام جیسے سوسائٹی کا جرم قرار دیا جاتا ہے۔ اور اخلاقی احکام سے ایسے احکام مراد ہیں جن کی خلاف ورزی معاشرتی جرم قرار نہ پائے۔ مثلاً: لَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا۔ (۱۷/۳۷) (زمین میں اکڑ کر نہ چلو) قرآن کا حکم ہے۔ لیکن یہ ایسا حکم نہیں جس کی خلاف ورزی معاشرہ کا جرم قرار دیا جائے۔ اسی سورت میں دوسرا حکم ہے۔ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی۔ (۱۷/۳۲) "زنا کے قریب مت جاؤ۔" ظاہر ہے کہ اس حکم کی خلاف ورزی معاشرتی جرم ہو گی۔

واضح رہے کہ احکام کی اخلاقی اور تعزیری تقسیم محض زیرِ نظر سوال کے سمجھنے کے لئے کی گئی ہے۔ ورنہ قرآنِ کریم کے ہر حکم کی بنیاد اصلاحِ اخلاق پر ہے۔ اور اخلاق سے مراد ہے انسانی ذات کی نشو و نما کے ذرائع۔

۲۔ تعزیری احکام بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کی سزا بھی قرآن نے خود ہی تجویز کر دی ہے۔ (مثلاً زنا) اور دوسرے وہ جن کی سزا اس نے خود تجویز نہیں کی بلکہ اسے اسلامی نظام پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ، حالات کے مطابق ان کی سزا خود متعین کرے۔ مثلاً اس نے الخمر (عرفِ عامہ میں شراب) کے استعمال سے منع کیا ہے لیکن اس حکم کی خلاف ورزی کی سزا مقرر نہیں کی۔

یہ مسئلہ بڑا غور طلب ہے کہ قرآنِ کریم نے جن احکام کی سزا خود مقرر نہیں کی، ان میں سے کون کون سے ایسے ہیں جنہیں تعزیری احکام کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب کوئی ایک فرد نہیں دے سکتا۔ نہ ہی کسی فرد کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی حکم کی خلاف ورزی کو معاشرتی جُرم قرار دے کر اسے مستوجبِ سزا ٹھہرائے۔ یہ فیصلہ اسلامی نظام کے کرنے کا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ جو فیصلے اسلامی نظام کرے گا اِن میں وقتاً فوقتاً (بہ تقاضائے حکمت) تبدیلیاں کی جا سکیں گی۔

احکام ہی نہیں۔ قرآنِ کریم نے جن امور کو بطورِ اصول بیان کیا ہے۔ یا جن حدود مقرر کی ہیں، ان کی خلاف ورزی کی مخصوص شکلوں کو جرم قرار دینا بھی اسلامی نظام کا فریضہ ہے۔ "حدود" کا لفظ میں نے فقہی اصطلاح — حدّ — کے معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ اس سے مراد ہے اعمال کا وہ دائرہ جس کے اندر رہنے کی آزادی ہے لیکن جس سے تجاوز کرنا منع ہے۔ حدود اور اصول ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

۳۔ اسلامی نظام کا فریضہ یہ ہے کہ وہ معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کرے جس میں ہر فرد اپنے ہر بنیادی حق، اپنی ہر متاعِ زیست کو اس طرح محفوظ سمجھے کہ اسے اس باب میں ذرا سا تردد، فکر یا تشویش لاحق نہ ہو۔ اسے اس کے متعلق پورا پورا اطمینان اور یقین حاصل ہو۔ قرآنی نظام کا لازمی نتیجہ اس قسم کی فضا کا وجود میں لانا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نظام میں افرادِ معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ: لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲/۳۸) "اس میں انہیں نہ خوف ہوگا، نہ حزن"۔ وہ اس فضا کو قرآنی اقدار کے مطابق تعلیم و تربیت اور افرادِ معاشرہ کو بنیادی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بے فکر کر دینے سے پیدا کرتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود معاشرہ میں بعض افراد ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو "نفسیاتی مریض" ہوں اور ان کا یا کُل پن افرادِ معاشرہ سے امن و اطمینان کا احساس چھین لے۔ ایسے مریضوں کا علاج ضروری ہے۔ اور جب تک وہ پورے طور پر شفایاب نہ ہوں افرادِ معاشرہ کو ان کے جنون کے پیدا کردہ خطرات سے محفوظ رکھنا از بس لازمی۔ یہ علاج اکثر و بیشتر ان مریضوں (مجرموں) کی قلبی اور ذہنی اصلاح سے ہو جاتا ہے لیکن بعض اوقات اس کے لئے بطورِ آخری اقدام، تخویف و ترہیب کی بھی ضرورت پیش آتی ہے — کئی نفسیاتی امراض ایسے ہیں، جن کا علاج خوف کی احساس دہی سے کیا جاتا ہے — اس طریقِ علاج کو سزا کہا جاتا ہے۔ اس سے مقصد اولاً خود اس مجرم کی اصلاح ہوتی ہے اور ثانیاً ان کی اصلاح جن کے تحت الشعور میں ارتکابِ جرم کے جراثیم پرورش پا رہے ہوں سزا بطورِ انتقام کا تصور غیر قرآنی ہے۔

یہ تو رہا سزا کا ایک مقصد۔ اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ مجرم نے جس شخص کو نقصان پہنچایا ہے اس کے نقصان کی تلافی کی جائے۔ مثلاً ایک شخص نے کسی کے ہاں چوری کی ہے۔ اگر عدالت نے اس مجرم کو دس سال قید کی بھی سزا دے دی تو اس سے اس مظلوم کے نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اس شخص کا نقصان پورا کیا جائے۔ اگر مال مسروقہ برآمد ہو گیا ہے تو اسے واپس دلایا جائے۔ اگر وہ برآمد نہیں ہوا تو نظامِ معاشرہ اُسے خود مہیا کرے یا اس کی قیمت ادا کرے۔ قرآنی تصورِ "جرم و سزا" کی رو سے مستغیث، مجرم کے خلاف مدعی نہیں ہوتا۔ وہ نظامِ معاشرہ (حکومت) کے خلاف مدعی ہوتا ہے معاشرہ نے اس سے وعدہ

فقہ کی رو سے حدّ قرآنِ مجید کی مقرر کردہ سزا کو کہتے ہیں اور تعزیرات ان سزاؤں کو جنہیں قرآنِ کریم نے مقرر نہیں کیا۔ فقہ نے مقرر کیا ہے۔

کیا تھا کہ وہ اس کی ہر متاع کی حفاظت کرے گا۔ اگر اس متاع پر کسی نے ہاتھ ڈال دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نظامِ معاشرہ نے اس شخص سے وعدہ خلافی کی ہے، اس لئے اس کے نزدیک 'مجرم' نظامِ معاشرہ ہے' نہ کہ وہ خاص فرد جس نے ارتکابِ جرم کیا ہے۔ یہ نظامِ معاشرہ کے دیکھنے کی چیز ہے کہ وہ اس نقصان کو مجرم سے پورا کراتا ہے یا خود پورا کرتا ہے۔ مظلوم کو اس سے واسطہ نہیں۔ نظامِ معاشرہ کا فریضہ مظلوم یا اس کے وارثوں کا پشت پناہ بننا اور ان کی مدد کرنا ہے۔ فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا...... إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا (۱۷/۳۳)
اگر نظامِ معاشرہ مظلوم کے نقصان کی تلافی نہیں کرتا، تو وہ اس کا پشت پناہ کیسے بن سکتا ہے، اور حامی و ناصر ہونے کا دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ہر نقصان کی تلافی روپے سے نہیں ہو سکتی۔ لیکن نظامِ معاشرہ کو بہرحال اس کی تلافی کی شکل پیدا کرنی ہوگی۔ بشرطیکہ وہ نقصان اس شخص کی غفلت یا تساہل کی وجہ سے نہ ہوا ہو ـــــ اس کی تلافی بھی کرنی ہوگی اور اس کے ساتھ اس کا انتظام بھی کہ آئندہ معاشرہ میں ایسا نہ ہو۔

۴۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ تعزیری سزاؤں سے مقصود یہ ہے کہ ارتکابِ جرم کے نفسیاتی محرکات کا علاج ہو جائے۔ نفسیاتی علاج کی کامیابی کی اوّلین شرط یہ ہے کہ مریض کو مرض کا احساس ہو جائے۔ یعنی مجرم دل سے اعتراف کرے کہ اس نے غلطی کی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر مجرم کے دل میں فی الواقعہ یہ احساسِ ندامت بیدار ہو جائے تو اس کی اصلاح کی امید ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں وہ "سزا دینے" کے بجائے معاف کر دیتا ہے اور پھر اس پر نگاہ رکھتا ہے کہ وہ شخص اپنی اصلاح کرے۔ اور ایسا کرنے میں معاشرہ اس کی ہر ممکن مدد کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سزا سے پہلے عفو (درگزر کر کے اصلاح کرنے) کی گنجائش رکھی ہے۔ وہ سزا اس صورت میں تجویز کرتا ہے جب مجرم میں اس کے سوا اصلاح کا امکان نہ ہو۔

۵۔ قرآن کریم، بدنی سزائیں (CORPORAL PUNISHMENTS) تجویز کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتا کہ چور جیل خانے بھیج دے جہاں اسے روٹی کپڑا ملتا رہے اور اس کے بیوی بچے بھوکوں مر جائیں۔ یعنی جرم وہ کرے اور سزا یہ بے گناہ بھگتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خوف جس سے عادی مجرموں کی اصلاح کا امکان ہو سکتا ہے یا جس سے امکانی مجرموں کو ارتکابِ جرم سے باز رکھا جا سکتا ہے، بدنی سزا ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔

۶۔ اب ان اصولوں کو دیکھئے جنہیں قرآن کریم اس باب میں بنیادی قرار دیتا ہے۔

۱۔ قصاص۔ اس کے معنی جرم کی سزا دینا نہیں۔ اس کے معنی ہیں مجرم کا اس طرح پیچھا کرنا کہ وہ بلا گرفت نہ رہ جائے۔ یعنی قرآنی نظام میں کسی جرم کو (LINT RACED) نہیں رہنا چاہیئے۔ وہ اس قسم کے محکم نظامِ تفتیش میں حیاتِ اجتماعیہ کا راز بتاتا ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ (۲/۱۷۹)۔

۲۔ عدل۔ یعنی فیصلہ کرتے وقت مجرم کی پوزیشن، عدل کے تقاضے پر کسی طرح اثر انداز نہ ہونے پائے ــــ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ۔ (۲/۱۷۸) کا اصول ہمیشہ کار فرما رہے۔

۳۔ جرم کی سزا، جرم کی نوعیت کے مطابق ہونی چاہیئے۔ اس سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔ وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ۔

سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ (۴۲/۴۰) یہ بھی اس صورت میں جب اس کے بغیر اصلاح کا امکان نظر نہ آئے۔

۴۔ جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے۔ ملزم کو بے گناہ سمجھنا اور معاشرہ کو اس کے متعلق حسنِ ظن سے کام لینا چاہیئے۔ سورۂ نور میں ہے کہ مدینہ میں بعض لوگوں نے کسی عورت کے خلاف تہمت تراشی کی اور لوگ اسے لے اڑے۔ اس پر قرآن کریم نے یہ ہدایت دی کہ تم نے جب افواہ سنی تھی تو تمہارا ردِّ عمل یہ ہونا چاہیئے تھا کہ: هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ۔ وَبُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔ (۲۴/۱۶-۱۷) یہ ایک مستقل راہ نمائی ہے کہ ملزم کے متعلق سوءِ ظن سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

۵۔ کسی قانون کے نافذ ہونے سے پہلے اگر کوئی کام ایسا ہو گیا ہو جو اس قانون کے خلاف ہو، تو اسے جرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بالفاظِ دیگر کسی قانون کا اطلاق کسی سابقہ تاریخ سے نہیں ہو سکتا۔ اس کا اطلاق اس کے نفاذ کے بعد سے ہوگا۔ قرآنِ کریم میں کئی ایک احکام کے سلسلہ میں کہا گیا ہے۔ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ... (۴/۲۳) جو اس سے پہلے ہو گیا اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

۶۔ جس فعل کے ارتکاب میں دل کا ارادہ شامل نہ ہو۔ (یعنی عمداً نہ کیا گیا ہو) اس پر مواخذہ نہیں ہوگا۔ سورۃ احزاب میں ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ۔ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ۔ (۳۳/۵) جو کچھ تم سے سہواً ہو جائے اس پر مواخذہ نہیں۔ مواخذہ اس پر ہے جس میں تمہارے دل کا ارادہ شامل ہو۔

لیکن لاپرواہی بھی الگ جرم ہے اور قابلِ سرزنش۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے قتلِ خطا (سہواً) کی سزا بھی تجویز کی ہے اگرچہ وہ سزا جرم قتل کی نہیں۔ بطور کفارہ کے ہے (۴/۹۲)

۷۔ بڑے بڑے جرائم سے بچنے والوں سے اگر کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہو جائے تو وہ قابلِ معافی ہوتی ہے ـــ سورۃ النجم میں ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ۔ (۵۳/۳۲) جو لوگ بڑے بڑے جرائم سے بچتے ہیں ان سے اگر کبھی کوئی معمولی سی لغزش ہو جائے تو قابلِ عفو ہے۔

۸۔ سزا تجویز کرتے وقت مجرم کی ذہنی سطح، تعلیم و تربیت اور معاشرتی احوال و کوائف کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اسی بنا پر قرآن نے (اس زمانے کی) لونڈیوں کی جرمِ زنا کی سزا شریف عورتوں سے نصف قرار دی (۴/۲۵) کیونکہ جس ماحول میں وہ پرورش پاتی تھیں اس کے پیشِ نظر ان سے بلند اخلاق کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ اس کے برعکس، رسول اللہؐ کے گھرانے کی خواتین سے کہا گیا کہ اگر ان سے کوئی جرم سرزد ہوا تو اس کی دُگنی سزا ہوگی۔ (۳۳/۳۰)

۹۔ قرآنِ کریم جس قسم کا معاشرہ قائم کرتا اور اس میں افرادِ معاشرہ کی تربیت جس انداز سے کرتا ہے اس سے وہ توقع رکھتا ہے کہ اگر کسی سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے گی تو وہ خود اس کا اعتراف کر لے گا اور صحیح صحیح بات کہہ دے گا۔ خواہ وہ اس کے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ (۴/۱۳۵) اس آیۂ جلیلہ میں قرآنِ کریم نے شہادت کے سلسلے میں ایسا بلند اصول پیش کیا ہے جس کی موجودگی میں عدل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ سکتی۔ (اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔)

۱۰- قرآن مجید کے پیشِ نظر مجرم کی اصلاح ہے، اس لئے وہ اس کے دل میں جرم کے مذموم ہونے کا احساس بیدار کرنے کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ایک عجیب و غریب اصول پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۔ (۴/۱۱۱) جو کسی کے خلاف ظلم و زیادتی کرتا ہے وہ بزعمِ خویش سمجھتا ہے کہ اس نے اس سے کسی دوسرے کو نقصان پہنچایا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ جرم خود اپنی ذات کے خلاف کرتا ہے اور اس کا نقصان خود اس کی ذات کو ہوتا ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ جرم سے خود مجرم کی اپنی ذات پر ایسا نقصان رسان اثر پڑتا ہے جس کی تلافی کسی خارجی سزا سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اگر مجرم کسی ترکیب سے اپنے آپ کو سزا سے بچا لے تو بھی اس سے جو نقصان اس کی ذات کا ہوا ہے وہ اس سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات وہ ہے۔ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ۔ (۴۰/۱۹) جو نگاہ کی خیانتوں اور دل کے پوشیدہ خیالات تک سے واقف ہے۔ یہ ہے وہ تعلیم جس سے وہ، مجرم کے دل میں احساسِ ندامت بیدار کرتا ہے۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو اسے سزا دینے کے بجائے اصلاح کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

اب ان جرائم کو لیجئے جن کی سزا قرآن کریم نے خود تجویز کی ہے۔ معاشرہ میں چار بنیادی چیزیں ہیں، جن کی حفاظت ضروری ہے۔ جان، مال، عصمت اور نظامِ معاشرہ۔ قرآن کریم نے ان ہی میں خلل اندازی کو بنیادی جرائم قرار دیا ہے۔ یعنی قتل، سرقہ، فواحش اور بغاوت (مع ان کی تضمنات کے) اس سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم نے جو سزائیں تجویز کی ہیں وہ انتہائی سزائیں (EXTREME PENALTIES) ہیں۔ جن میں حالات کے مطابق تخفیف ہو سکتی ہے۔

(۱) جرمِ قتل

قرآنِ کریم نے عمد قتل (بالارادہ) اور قتل خطا (سہواً) میں فرق کیا ہے۔ قتل خطا کی سزا (یا یوں کہئے کہ کفارہ یا جرمانہ) ایک مومن غلام کا آزاد کرنا اور مقتول کے وارثوں کو خوں بہا ادا کرنا ہے۔ وہ اس خوں بہا کو معاف بھی کر سکتے ہیں۔ (۴/۹۲-۹۳ و ۲/۱۷۸) واضح رہے کہ "غلام آزاد کرنا" اس زمانے کی بات ہے، جب عربوں کے ہاں غلام چلے آتے تھے۔ اسلام نے غلامی کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ لہٰذا اب نظامِ معاشرہ تجویز کرے گا کہ اس کی جگہ کیا کفارہ ادا کیا جائے گا۔

قتلِ عمد کے لئے دیت (خوں بہا) نہیں۔ اس کی سزا بڑی سخت ہے۔ اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کی سزا جہنم ہے اور اللہ کا غضب اور اس کی لعنت اور بہت بڑی سزا۔ (۴/۹۳) میں اس وقت ان مختلف سزاؤں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن یہ واضح رہے کہ قتلِ عمد کی بھی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں۔ ایک قتل سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت ہوتا ہے۔ ایک قتل جوش میں آ کر وقتی طور پر (وغیرہ وغیرہ) اس اعتبار سے اس جرم

کی سزا میں بھی فرق ہو سکتا ہے۔ قرآن کے مختلف مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عدل کے تقاضے کی رو سے جرمِ قتلِ عمد کے لئے موت کی سزا بھی تجویز کرتا ہے۔ (مثلاً ۲/۱۷۸ و ۵/۳۲ و ۱۷/۳۳) "قتل نفس بالحق" سے مراد ہے قانونِ خداوندی کے مطابق کسی کی جان لینا۔

(۲) بغاوت

اس کے لئے قرآن کریم نے "خدا اور رسولؐ کے خلاف جنگ" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یعنی قرآنی نظامِ مملکت کے خلاف جنگ۔ اسے "فساد فی الارض" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یعنی اس نظام کے خلاف کھلی ہوئی جنگ ہی نہیں، بلکہ اسے درہم برہم کرنے اور ابتری پھیلانے کی کوشش کرنا۔ اس جرم کی سزا۔ (۱) قتل کرنا۔ (۲) صلیب دینا۔ (۳) قطع ید و ارجل۔ یا (۴) جلاوطن کرنا (یا نظر بند کرنا) ہے۔ (۵/۳۳) عدالت، حسبِ حالات جو سزا مناسب سمجھے عائد کر دے۔

ان لوگوں سے دوستی رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہوں (۵۸/۲۲) لیکن اس کی سزا قرآن نے تجویز نہیں کی۔

(۳) حفاظتِ عصمت

عصمت کو قرآن بڑی اہمیت دیتا ہے اس لئے اس شعبہ کے مختلف گوشوں کو قرآنِ کریم سامنے لا کر، ان سے متعلق جرائم اور ان کی سزا بیان کرتا ہے۔ مثلاً :-

(۱) عام بے حیائی کی باتیں جنہیں اگر روکا نہ کیا جائے تو وہ زنا تک لے جانے کا موجب بن جائیں۔ اس کے انسداد کے لئے کہا کہ ایسی عورتوں کو پابندِ مسکن کر دیا جائے۔ ان کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر دی جائے۔ (۴/۱۵) اس کے لئے چار گواہوں کی ضرورت ہوگی۔

(۲) زنا۔ اس کی سزا عورت اور مرد دونوں کے لئے سو سو کوڑے ہیں۔ (۲۴/۲) ظاہر ہے کہ زنا بالجبر میں عورت مظلوم قرار پائے گی نہ کہ مجرم۔ (اس لئے اسے سزا نہیں دی جائے گی) قرآن کریم نے نکاح کے علاوہ جنسی تعلق کی ہر صورت کو زنا قرار دیا ہے۔ (۲۳/۷)

جرمِ زنا میں لونڈیوں کی سزا شریف عورتوں سے نصف ہوگی۔ (۴/۲۵) یعنی پچاس کوڑے۔ (سنگ ساری۔ رجم کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں۔)

(۳) شریف عورتوں کے خلاف تہمت تراشی کی سزا اسّی کوڑے ہے۔ (۲۴/۴) اس کے لئے چار گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ علاوہ بریں، ایسے لوگوں کو شہادت کے لئے ساقط الاعتبار قرار دیا جائے گا۔ (۲۴/۴) اگر تہمت تراشی کا معاملہ میاں بیوی میں ہو اور اس لئے گواہ نہ مل سکیں، تو اس کے لئے "لعان" تجویز کیا گیا ہے جس کی تفصیل ۲۴/۶-۹ میں دی گئی ہے۔

۴۔ شریف زادیوں کو چھیڑنا

قرآنِ کریم کی رو سے شریف زادیوں کو چھیڑنا۔ انہیں راستہ چلتے ہوئے تنگ کرنا، اذیت پہنچانا۔ سنگین ترین جرم ہے۔ اس لئے کہ اس سے وہ احساسِ امن (SENSE OF SECURITY) ختم ہو جاتا ہے جس کا پیدا کرنا اور قائم رکھنا اسلامی نظامِ معاشرہ کا بنیادی فریضہ ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کی روک تھام کے لئے تدریجی سزائیں تجویز کی ہیں یعنی انہیں حقوقِ شہریت سے محروم کر دینا۔ شہر بدر کر دینا۔ جہاں ملیں گرفتار کر لینا۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو شدید طور پر قتل کر دینا۔ (۳۳/۶۰-۶۱) اس لئے کہ یہ فساد فی الارض کی بدترین شکل ہے۔

۵۔ سرقہ

قرآنِ کریم میں سارق، عورت یا مرد، کی سزا قطعِ ید آئی ہے۔ (۵/۳۸) قرآن نے السارق اور السارقہ کہا ہے۔ یہاں "ال" کس بات کو متعین کرتا ہے ـــــ یعنی سارق کسے کہتے ہیں اور سرقہ کی (DEFINITION) کیا ہے، اسے نظامِ اسلامی متعین کرے۔ اسی طرح "قطعِ ید" کا مفہوم مجازی ہے یا حقیقی، اس کا فیصلہ بھی وہی نظام کرے گا۔ اس سزا کا مقصد قرآن نے نکالًا من اللہ بتایا ہے۔ یعنی "خدا کی طرف سے انسدادِ جرم" اور اس کے بعد "تاب و اصلح" ـــــ عفو و اصلاح کی گنجائش کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ (۵/۳۹)

قرآنِ کریم میں انہی جرائم کی سزا کا تعین کیا گیا ہے۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر کسی مجرم کو عدالت سے سزا مل جاتی ہے تو کیا وہ اس سے آخرت کے مواخذہ سے چھوٹ جاتا ہے؟ اس کے لئے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ آخرت کا مواخذہ کہتے کسے ہیں؟ انسان کے ہر عمل (حتیٰ کہ خیال تک) کا اثر اس کی ذات پر ہوتا ہے اور انہی اثرات کے مجموعی نتیجہ کے مطابق اُس کی اُخروی زندگی مرتب ہوتی ہے۔ مجرم کے جرم کا ایک اثر سوسائٹی پر پڑتا ہے اور دوسرا اثر خود اس کی ذات پر۔ عدالت کی طرف سے ملی ہوئی سزا سوسائٹی کے خلاف جرم کا تو ازالہ کر دیتی ہے لیکن اس جرم کا جو اثر مجرم کی ذات پر مرتب ہوا تھا اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔ اس کی تلافی اسے خود کرنی ہوگی۔ اس کے لئے احساسِ ندامت پہلا مرحلہ ہے جس کا نتیجہ توبہ ہوتا ہے۔ یعنی آئندہ کے لئے اس جرم سے محتاج رہنے کا تہیّہ۔ اس کے بعد اصلاح کا مرحلہ آتا ہے۔ یعنی ایسے تعمیری کام کرنا جن سے اس نقصان کی تلافی ہو جائے جو اس جرم کے ارتکاب سے اس کی ذات کو پہنچا تھا ـــــ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴) قرآنِ کریم کے قانونِ مکافات کا بنیادی اصول ہے۔ یہ ہے وہ طریق جس سے مجرم "آخرت کے مواخذہ" سے بچ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کا خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل (آخرت) پر ایمان ہو اس سے جرم سرزد ہی بہت کم ہوتا ہے۔

قطعِ ید اور دُوسرے شرعی حُدود

(سیّد ابوالاعلیٰ مودودی)

(حالیہ ہنگاموں میں نظامِ شریعت نافذ کرنے کے مطالبہ کے سلسلہ میں سب سے زیادہ زور، شرعی سزاؤں کے نفاذ پر دیا گیا۔ یہ سزائیں کس قسم کی مملکت اور کن حالات میں نفاذ پذیر ہوں گی، اس کے متعلق مودودی صاحب کی تصریحات ملاحظہ فرمائیے۔
طلوعِ اسلام)

تعزیرات کے باب میں سب سے پہلے اس قاعدۂ کلیہ کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا اور دوسری شرعی حدیں صرف اُسی جگہ نافذ کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہیں جہاں مملکت کا نظم و نسق اسلامی اصولوں پر ہو اور تمدن و معاشرت کی ترتیب و تنظیم اس طرز پر کی گئی ہو جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔ اسلام کے اصول اور قوانین ناقابلِ تجزیہ ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ بعض اصول اور قوانین تو نافذ کئے جائیں، اور بعض کو چھوڑ دیا جائے۔

مثلاً زنا اور قذف[1] کی حدود کو لیجئے۔ نکاح و طلاق اور حجاب شرعی کے اسلامی قوانین اور اخلاق صنفی کے متعلق اسلام کی تعلیمات سے ان حدود کا نہایت گہرا ربط ہے جسے منفک نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالےٰ نے زانی اور قاذف کے لئے ایسی سخت سزائیں مقرر ہی اس سوسائٹی کے لئے فرمائی ہیں جس میں عورتیں بن سنور کر بے محابا نہ پھرتی ہوں، جس میں برہنہ اور نیم برہنہ تصویریں اور عشق و محبت کے افسانے اور شہوانی جذبات کو دائماً متحرک کرنے والے تماشے رائج نہ ہوں، جس میں نکاح کے لئے پوری آسانیاں ہوں، اور فسخ و تفریق اور طلاق و خلع کے اسلامی احکام ٹھیک ٹھیک نافذ کئے جاتے ہوں۔ ایسی سوسائٹی عین فطرت کے اعتبار سے اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ اس میں معاشرت کا جو معتدل نظام قائم کیا گیا ہے اس کی حفاظت کے لئے سخت سزائیں مقرر کی جائیں۔ اور یہ اتنی سخت سزائیں اس حالت میں ہرگز نامنصفانہ نہیں ہیں جبکہ جائز ذرائع سے صنفی خواہشات کی تسکین آسان کر دی گئی ہو اور معاشرت کے ماحول کو بدکاری کی سہولتوں اور غیر معمولی اسبابِ تحریک سے پاک کر دیا گیا ہو۔ ان حالات میں صنفی جرائم کا ارتکاب صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو غایت درجہ کے بدطینت ہوں اور جن کے شر سے خلق اللہ کو محفوظ رکھنے کے لئے نہایت عبرت ناک

---

[1] قذف سے مراد کسی عورت یا مرد پر زنا کی تہمت لگانا ہے۔ اور قاذف وہ شخص جو ایسی تہمت لگائے۔

سزاؤں کے بغیر ہو پاتا نہ ہو۔

لیکن جہاں حالات اس سے مختلف ہوں، جہاں عورتوں اور مردوں کی سوسائٹی مخلوط رکھی گئی ہو، جہاں مدرسوں میں، دفتروں میں، کلبوں اور تفریح گاہوں، خلوت اور جلوت میں ہر جگہ جوان مردوں اور بنی ٹھنی عورتوں کو آزادانہ ملنے جلنے اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملتا ہو۔ جہاں ہر طرف بے شمار صنفی محرکات پھیلے ہوئے ہوں اور ازدواج دائرہ کے باہر خواہشات کی تسکین کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بھی موجود ہوں۔ جہاں معیار اخلاق بھی اتنا پست ہو کہ ناجائز تعلقات کو کچھ بہت معیوب نہ سمجھا جاتا ہو، ایسی جگہ زنا اور قذف کی شرعی حد جاری کرنا یقیناً ظلم ہوگا۔ اس لئے کہ وہاں ایک معمولی قسم (NORMAL TYPE) کے معتدل مزاج اور صحیح الفطرت آدمی کا بھی زنا سے بچنا مشکل ہے اور ایسے حالات میں کسی شخص کا مبتلائے گناہ ہو جانا یہ نتیجہ نکالنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ وہ غیر معمولی قسم (ABNORMAL TYPE) کا اخلاقی مجرم ہے۔ رجم اور کوڑوں کی سزا درحقیقت ایسے گندے حالات کے لئے اللہ نے مقرر ہی نہیں کی ہے۔

اسی پر حد سرقہ کو بھی قیاس کر لیجئے کہ وہ صرف اس سوسائٹی کے لئے مقرر کی گئی ہے جس میں اسلام کے معاشی تصورات اور اصول اور قوانین پوری طرح نافذ ہوں۔ قطع ید اور اسلامی نظم معیشت میں ایسا رابطہ ہے جس کو منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں یہ نظم معیشت قائم ہو وہاں قطع ید بھی عین انصاف اور عین مقتضائے فطرت ہے۔ اور جہاں یہ نظم معیشت نہ ہو وہاں چور کا ہاتھ کاٹنا دوہرا ظلم ہے۔ درحقیقت میں ہاتھ کاٹنے کی سزا اس ظالم سوسائٹی کے لئے مقرر ہی نہیں کی گئی ہے جس میں سود جائز ہو، زکوٰۃ متروک ہو، انصاف قیمتاً فروخت کیا جاتا ہو، ٹیکسوں کی بھرمار سے ضروریاتِ زندگی نہایت گراں ہو گئی ہوں اور تمام ٹیکس چند مخصوص طبقوں کے لئے سامانِ عیش فراہم کرنے پر صرف ہوتے ہوں۔ ایسی جگہ تو چوری کے لئے ہاتھ کاٹنا ہی نہیں بلکہ قید کی سزا بھی بعض حالات میں ظلم ہوگی۔

عام طور پر اسلامی قانونِ فوجداری کو سمجھنے میں لوگوں کو جو دقت پیش آتی ہے اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ اپنے پیشِ نظر تو رکھتے ہیں سوسائٹی کے اس غلط نظام کو جو اس وقت دنیا کے متمدن ممالک میں قائم ہے، اور پھر چوری، زنا، قذف اور شراب نوشی جیسے "عامۃ الورود" جرائم کا موازنہ قطع ید، رجم اور کوڑوں کی سزاؤں سے کر کے رائے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس موازنہ میں ان کو اسلام کی سزائیں سخت اور ہولناک ہی نظر آئیں گی۔ کیونکہ نیم شعوری طور پر وہ خود سمجھتے ہیں کہ جو حالات اس نظامِ حیات نے پیدا کر رکھے ہیں ان میں چوری ایک عام چیز ہونی ہی چاہئے۔ زنا میں بکثرت مردوں اور عورتوں بلکہ بچوں اور بوڑھوں تک کو مبتلا ہونا ہی چاہئے۔ آئے دن مختلف طریقوں سے ملنے والے جوڑوں کے متعلق بُری خبریں مشہور ہونی ہی چاہئیں۔ بڑی تعداد میں تو غیر [illegible] بڑھتی ہی جانی چاہئیں۔ لہٰذا ان کا دل یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہے کہ اگر ان حالات میں اسلامی قانونِ فوجداری رائج کر دیا جائے تو شاید کوئی پیٹھ بھی کوڑوں سے نہ بچ سکے، ہزارہا آدمیوں کے ہاتھ روزانہ کٹنے لگیں، اور ہر روز سینکڑوں آدمی سنگسار کئے جائیں۔

ہاں بے شبہ ان کا یہ خوف بالکل بجا ہے۔ اس بیہودہ سوسائٹی کے بیہودہ نظام کو باقی رکھ کر اسلام کے قوانین

ہیں سے محض اس کے قانونِ فوجداری کو نافذ کر دینا ہمارے نزدیک بھی ویسا ہی ظلم ہوگا جیسا وہ خیال کرتے ہیں۔ مگر جس غلطی کو وہ محسوس نہیں کرتے وہ دراصل یہ ہے کہ انہوں نے سوسائٹی کے اس بے ہودہ نظام کو، جس کی بیہودگیوں سے وہ مانوس ہو چکے ہیں ایک فطری حالت سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ یہ فطری حالت ہی نہیں ہے، بلکہ شیطانیت کے غلبہ نے اس غیر فطری حالت کو عالمِ انسانی پر مسلّط کر دیا ہے اور اس حالت کا باقی رہنا بجائے خود ایک ظلمِ عظیم ہے۔ آپ اسلام کے نظامِ اجتماعی کو من حیث الکل قبول کر کے اس ظلم کا انسداد کیجئے۔ پھر آپ پر منکشف ہو جائے گا کہ زنا اور قذف اور چوری اور شراب نوشی انسان کے عام اور فطری مشاغل نہیں ہیں اور انسانوں کی کثیر تعداد کا ان میں مبتلا ہونا متوقع ہی نہیں ہے۔ جو اجتماعی حالات اسلام پیدا کرتا ہے ان میں صرف غیر معمولی قسم کے چند افراد ہی ان افعالِ قبیحہ کا ارتکاب کر سکتے ہیں اور ان کے لئے صحیح تدارک رجم اور کوڑے اور قطعِ ید ہی ہو سکتے ہیں۔

(تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صـ۲۸۰-۸۳ ۔ اگست ۱۹۵۱ء ایڈیشن)

وہ آخر میں لکھتے ہیں:۔

"اقامتِ حدود میں وقت کے حالات اور ملزم کے حالات کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔ زمانۂ جنگ میں حد موقوف رکھی جاتی ہے۔ قحط کے زمانے میں بھی چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا۔ ملزم کے حالات سے اگر ثابت ہو کہ حقیقت میں وہ چوری پر مجبور ہو گیا تھا تب بھی اس کے ساتھ رعایت کی جاتی ہے۔ مثلاً حاطب ابن ابی بلتعہ کے غلاموں کا قصہ آثار میں منقول ہوا ہے کہ انہوں نے قبیلہ مُزَینہ کے ایک شخص کا اونٹ چرا لیا تھا۔ مُزَنی نے آکر حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ آپ نے مقدمہ کی تحقیقات کے بعد حکم دے دیا کہ ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں۔ پھر دفعتہً آپ کو ان غلاموں کے حالات کی طرف توجہ ہوئی اور آپؓ نے فرمایا کہ "تم نے ان غریبوں سے کام لیا مگر ان کو بھوکا مار دیا اور اس حال کو پہنچایا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص حرام چیز کھا لے تو اس کے لئے وہ جائز ہو"۔ یہ کہہ کر حضرت عمرؓ نے ان غلاموں کو چھوڑ دیا اور ان کے مالک حضرت حاطب سے اونٹ والے کو تاوان دلوایا۔ اس قسم کی اور متعدد مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا قانون اندھا قانون نہیں ہے بلکہ وہ فرق کرتا ہے اس شخص میں جو حقیقتاً ارتکابِ جرم پر مجبور ہو گیا ہو، اور اس شخص میں جس نے حقیقی مجبوری کے بغیر جرم کیا ہو۔ اسی بنا پر غیر شادی شدہ زانی اور شادی شدہ زانی کی سزا میں فرق کیا گیا ہے۔ اور اسی بنا پر قحط کے مارے ہوئے شخص اور کھاتے پیتے شخص کی چوری کو ایک مرتبے میں نہیں رکھا گیا۔"

(ایضاً۔ صـ۲۸۹)

(۲) مودودی صاحب اپنے مندرجہ بالا مقالہ کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

اس سلسلے میں اپنے دلائل دیتے ہوئے میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی قانونِ فوجداری کی دفعات اس مملکت کے لئے ہیں جس میں پورا اسلامی نظامِ زندگی قائم ہو نہ کہ اس مملکت کے لئے جس میں سارا نظام کفر کے طریقوں پر چل رہا ہو اور صرف ایک چوری یا زنا کی

سزا اسلام کے قانون سے لے لی جائے۔ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا عین انصاف ہے۔ اگر ملک کا معاشی نظام بھی اس کے ساتھ اسلامی احکام کے مطابق ہو۔ اور یہ قطعی ظلم ہے، اگر ملک میں اسلام کے منشا کے خلاف سود حلال اور زکوٰۃ متروک ہو اور حاجت مند انسان کی دستگیری کا کوئی انتظام نہ ہو۔ اس ساری گفتگو میں سے اگر کوئی شخص صرف اتنی سی بات نکال لے کہ چونکہ چور کا ہاتھ کاٹنے کو یہ شخص ظلم کہتا ہے تو آپ خود ہی سوچئے کہ اس کی سخن فہمی کا ماتم کیا جائے یا دیانت کا۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ چہارم۔ صفحہ ۱۸-۱۹ اشاعت اوّل)

اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

اس وقت اگر کوئی مسلمان حکومت اسلام کے تمام احکام و قوانین اور اس کی ساری اصلاحی ہدایات کو معطل رکھ کر اس کے قوانین میں سے صرف حدودِ شرعیہ کو الگ نکال لے اور عدالتوں میں ان کو نافذ کرنے کا حکم دے دے، تو جو قاضی یا جج کسی زانی یا سارق یا شارب خمر پر حد جاری کرنے کا حکم دیگا وہ تو ظالم نہیں ہوگا، البتہ وہ حکومت ضرور ظالم ہوگی جس نے شریعت الٰہیہ کے ایک حصے کو معطل اور دوسرے حصے کو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۷۴-۷۵)

ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ احکامِ شریعت کو فوراً نافذ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

اب اگر ہم اسلامی قانون کو از سرِ نو قائم کرنا چاہیں تو یہ تبدیلی بھی یک لخت نہیں، بتدریج ہی ہوگی۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۵۲)

مودودی صاحب کی ان تصریحات کی روشنی میں، فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مملکتِ پاکستان کے حالات ایسے ہیں کہ یہاں قوانینِ شریعت فوری طور پر نافذ ہو سکیں؟

طلوع اسلام کا سالانہ چندہ

(۱) پاکستان ——— ۱۸/- روپے

(۲) غیر ممالک (بذریعہ بحری ڈاک۔ رجسٹرڈ) ——— ۳ پونڈ ——— ۵۰/- "

(۳) غیر ممالک (بذریعہ ہوائی ڈاک۔ ") برائے:

(۱) برطانیہ۔ فرانس۔ سوئٹزرلینڈ وغیرہ ——— ۵۰/- + ۵۱/- = ۱۰۱/- "

(۲) دبئی۔ بحرین۔ کویت۔ سعودی عرب وغیرہ ——— ۵۰/- + ۲۶/- = ۷۶/- "

(۳) لیبیا۔ کینیا۔ یوگنڈا۔ جنوبی افریقہ ——— ۵۰/- + ۴۶/- = ۹۶/- "

(۴) امریکہ۔ کینیڈا وغیرہ ——— ۵۰/- + ۱۰۸/- = ۱۵۸/- "

(۵) نیوزی لینڈ ——— ۵۰/- + ۸۴/- = ۱۳۴/- "

(ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ گلبرگ ۲۔ لاہور)

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

تعویذ گنڈوں کا اسلام

سے کوئی تعلق نہیں

طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۷۵ء میں تعویذ گنڈوں کے بارے میں کچھ ایسی تفصیلات شائع ہوئی تھیں جن سے واضح ہوتا تھا کہ اس کاروبار کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ اس کی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ کیونکہ ان میں شرک کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ اس کی تائید میں رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا تھا:۔

عن عبد اللّٰہ بن مسعود قال سمعتُ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم یقولُ انّ الرّقی، والتمائم، والتولۃُ شرکٌ۔ رواہُ احمد و ابوداؤد و ابن ماجہ۔ وَالتولۃ صنفٌ من السحرِ قال الاصمعی ھو ھُوَ تحبیبُ المراۃُ الیٰ زوجِہا۔

(نیل الاوطار جلد ہفتم صفحہ ۲۱۸)

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ آپ نے رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے سنا کہ جھاڑ پھونک کرانا، تعویذ اور گنڈے شرکیہ افعال ہیں۔ اس حدیث کو امام احمد، امام ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ (یہ بھی کہا گیا ہے کہ) تولہ (جس میں تعویذ اور گنڈے دونوں کا مفہوم شامل ہے) جادو کی ایک قسم ہے۔ اصمعی کہتے ہیں کہ اس عمل سے عورت کو خاوند کے نزدیک زیادہ محبوب بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

میرے ایک واقف مولوی صاحب اس مضمون کی وجہ سے طلوعِ اسلام پر سخت خفا ہوئے۔ ان کی خفگی کی وجہ یہ تھی کہ اس سے ان کا "کاروبار" متاثر ہوتا تھا۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اس مضمون میں جو شرعی دلائل دیئے گئے ہیں ان کی بابت اطمینان کر لیں۔ اگر وہ غلط ہیں تو آپ کا غصہ بجا۔ لیکن اگر وہ صحیح ہیں تو پھر آپ کو یہ ناجائز کاروبار ترک کر دینا چاہیئے۔ اس سلسلے میں طلوعِ اسلام فراخدلی سے آپ کے نگارشات شائع کرے گا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے مضمون کے اندراجات کو تفصیل سے چیک کیا اور خاموش ہو گئے۔ تاہم ان کے طرزِ عمل سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی موقع کی تلاش میں ہیں۔

اور یہ موقع انہیں جلد ہی مل گیا۔ ایک مجلس میں برصغیر کے مخلص علماء کا ذکر ہو رہا تھا۔ ان میں مولانا

شبیر احمد صاحب عثمانی اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا ذکر بھی آیا۔ میں نے ان کے اخلاص اور تقویٰ کی تعریف کی۔ میرے محترم دوست تو موقع کی تلاش میں تھے فوراً بولے کہ آپ لوگ جس ہستی (یعنی ——— مولانا اشرف علی تھانوی کے اخلاص کی تعریف کر رہے ہیں)، وہ تو تعویذ گنڈے جائز قرار دیتے تھے پھر آپ لوگ انہیں کیسے خلافِ اسلام قرار دیتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ اس معاملے میں ہمارے جائز یا ناجائز قرار دینے کا سوال نہیں ہے۔ ہم نے تو یہ دیکھنا ہے کہ اس بارے میں شریعتِ اسلامیہ کا حکم کیا ہے۔ اور جب خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم ایسے معاملات کو شرکیہ امور میں داخل فرماتے تھے تو یقین نہیں آتا کہ کوئی متقی عالمِ دین اسے جائز قرار دے دے۔ ہو سکتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ بالا ارشاد ان کی نظروں سے نہ گزرا ہو۔ بایں ہمہ اسلام کے تفصیلی مطالعے سے ان کے اندر ایسا ذوق پیدا ہو جانا چاہیئے تھا کہ اگر کسی معاملے میں شرک کا معمولی سا شائبہ بھی موجود ہو تو انہیں اس کا اندازہ ہو جائے کہ یہ بات شرعاً جائز نہیں ہو سکتی۔ اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے تعویذ گنڈوں کے کاروبار کو اسلامی قرار دیا ہو۔ چنانچہ میں نے جب اس مقصد کے لئے مولانا مرحوم کی تصانیف کا مطالعہ کیا تو اس سے میرے خیالات کی تائید ہوگئی۔ اس مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ اگرچہ مولانا نے بعض مجبوریوں کے تحت کبھی کبھار تعویذ لکھے لیکن وہ اس کاروبار کا تعلق اسلام سے نہیں جوڑتے تھے بلکہ اسے ایک نفسیاتی علم قرار دیتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ اسے چاہے کافر ہی کیوں نہ اختیار کر لے اس سے وہی نتائج مرتب ہوں گے۔ آپ کے الفاظ میں :-

> فرمایا کہ تعویذ دینے سے اچھا ہو جانا کچھ تعویذ دینے والے کی بزرگی کی وجہ سے تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ بلکہ جس کی قوتِ خیالیہ قوی ہوتی ہے اس کے تعویذ میں اثر زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص بہت زیادہ قوتِ خیالیہ رکھتا ہو تو اس کے محض سوچنے ہی سے جاڑا بخار اتر جاتا ہے چاہے وہ کافر ہی ہو۔ کیونکہ یہ قوت تو اس میں بھی موجود ہے اور یہ مشق سے اور بڑھ جاتی ہے[1]۔ بالخصوص بعض طبائع کو تو اس سے خاص مناسبت ہوتی ہے۔
>
> (ملفوظات کمالاتِ اشرفیہ مطبوعہ کراچی صفحہ ۲۷۳)

پھر جو لوگ آپ سے تعویذ لکھوانے آتے تھے ان کی مختلف طریقوں سے حوصلہ شکنی کرتے تھے۔ کبھی فرماتے کہ "مجھے دس خط لکھنا آسان اور ایک تعویذ لکھنا موت ہے۔ اور بہت سے آدمی تو ان تعویذوں کی بدولت ہلاک ہو جاتے ہیں، کیونکہ تعویذوں کے بھروسے پر مریض کے مرض کا علاج کرتے نہیں، اور مریض

---

[1] پرویز صاحب تصوف کے متعلق مدت سے لکھتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ ایک فنی چیز ہے جس کا دین سے کچھ واسطہ نہیں۔ منتہیں مشقوں سے جو چاہے اسے حاصل کر سکتا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

ختم ہو جاتا ہے۔" (بحوالہ مذکورہ بالا صفحہ ۲۹۰)

کبھی فرماتے کہ "عملیات سے جو ہوتا ہے اس میں برکت نہیں ہوتی، قلوب پر اثر نہیں پڑتا۔"
(ایضاً۔ صفحہ ۲۹۲)

اسی بنا پر آپ نے اپنے تمام مریدوں اور عقیدت مندوں کو تعویذ گنڈوں سے منع فرما دیا تھا۔ آپ ہی کے الفاظ میں:۔

فرمایا کہ طالبانِ حق تعالےٰ کے لئے عملیات کی طرف رجوع کرنا مناسب نہیں۔ البتہ دعا کرنا سب حاجاتِ مشروعہ کے لئے مسنون اور نافع ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۵۴)

اور کبھی کبھار کسی مجبوری کے تحت آپ نے جو تعویذ لکھے اور اس موضوع پر جو کتابچہ تحریر فرمایا تو اس کے متعلق یہ تصریح فرما دی کہ اس سے ان کا مقصد جاہل مسلمانوں کو شرکیہ افعال سے بچانا تھا۔ اس سلسلے میں آپ نے فرمایا:۔

کہ میں نے اعمالِ قرآنی کو اس وجہ سے لکھ دیا ہے کہ لوگ کافروں جوگیوں وغیرہ کے پھندے میں نہ پھنسیں اور حدیث و قرآن ہی میں مصروف رہیں ورنہ مجھے تعویذ گنڈوں سے زیادہ دلچسپی نہیں اور نہ میں اس فن کا آدمی ہوں۔ (ف) اس سے حضرت والا کا تنفر عملیات سے معلوم ہوا۔ (ایضاً۔ صفحہ ۳۱۵)

اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ایک شرک سے بچانے کے لئے ایسا طریقہ کیوں اختیار کیا گیا کہ اس میں بھی کسی نہ کسی حیثیت سے شرک کا شائبہ موجود ہے۔ میرے خیال میں یہ اعتراض حضرت مولانا کی نظروں سے اوجھل نہیں تھا۔ چنانچہ ایک مقام پر اس کی بھی انہوں نے وضاحت فرما دی تھی۔

فرمایا کہ یہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ جس جگہ دو قسم کے ضرر جمع ہوں ایک اشد اور دوسرا اہون (یعنی ہلکا) تو اہون کو اختیار کرنا چاہیئے۔[2] (ایضاً۔ صفحہ ۱۱۴)

ہم نے یہ اقوال مولانا (مرحوم) کی صرف ایک کتاب سے پیش کئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی دوسری کتابوں سے اور بھی مواد مل جائے۔ لیکن جو کچھ ہم نے پیش کیا ہے وہ ہمارے مطلب کے لئے کافی ہے جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حقیقت پسند علماء نے گنڈے تعویذوں کو کبھی اسلامی شعار قرار نہیں دیا۔ اگر کوئی اس کے قائل تھے تو وہ اسے ایک نفسیاتی قوت قرار دیتے تھے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور کافر اور مسلمان دونوں اسے اختیار کر کے مطلوبہ نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اگر بامرِ مجبوری بعض مخصوص حالتوں میں انہوں نے تعویذ گنڈوں کی اجازت دی تو اس سے ان کا مقصد جاہل مسلمانوں کو شرکیہ خرافات سے بچانا تھا۔

طلوعِ اسلام:۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے اس قسم کی دلیلیں کچھ وزن نہیں رکھتیں۔ انہی سے تو شرک آگے پھیلتا ہے۔

---

[1] مولانا مرحوم کی ایک کتاب کا نام ہے جس میں قرآنی آیات کے ورد، وظائف، تعویذ وغیرہ درج کئے گئے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

[2] ہمارے نزدیک یہ دلیل کمزور ہے۔ شرک بہرحال شرک ہے۔ اس میں اشد اور اہون کی تفریق کیا؟ (" ")

طلوعِ اسلام کنونشن سنہ ۱۹۷۶ء

بزمِ مذاکرہ

(قسط چہارم)

(بزمِ مذاکرہ قسط اوّل، دوم و سوم، جنوری، مارچ و مئی ۱۹۷۷ء کے شماروں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اب قسط چہارم پیشِ خدمت ہے۔)

۸۔ مقبولِ الٰہی

صاحبِ صدر، محترم باباجی اور معزز خواتین و حضرات!

السّلام و علیکم

آج کے مذاکرے کا عنوان جب میرے سامنے آیا یعنی ؎

سبب کچھ ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے!
زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

تو میں نے اس کے مفہوم و معانی پر غور کرنا شروع کیا۔ کافی غور و خوض کے بعد اس کے دوسرے مصرعے کا مفہوم تو میری سمجھ میں آگیا کہ ؎

زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

کیونکہ میں نے دیکھا کہ اگرچہ اس اُمّت کا خاصا حصہ مفلسی اور زبوں حالی میں بھی مبتلا ہے۔ تاہم اس کے اچھے خاصے حصّے اور پوری قوم کے ہاں بحیثیتِ مجموعی مادّی وسائل کی فراوانی ہے۔ بلکہ اس کے بیشتر ممالک کی یہ کیفیت ہے کہ زرِ سیّال کا ایک بحرِ بے کراں اُن کے قدموں کے نیچے ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اور وہ خود یہ اعلان کر رہے ہیں کہ اُن کے پاس اس قدر دولت ہے کہ اس کا مصرف ہی ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس اُمّت کا ایک متموّل فرد آٹھ کروڑ ۲۴۴ قیراط وزن کے ایک گلابی رنگ کے ہیرے پر کہ جس کی قیمت کا اندازہ خود ماہرین کے نزدیک بھی چند لاکھ ڈالر سے زیادہ نہ تھا، ایک ارب بجالوے کروڑ ڈالر بے دھڑک خرچ کر ڈالتا ہے جیسے یہ اس کے لئے بالکل معمولی بات ہے (فیڈ بیک ۲ مئی۔ اے پ۔ بحوالہ نوائے وقت راولپنڈی)

اس ملت کے بحیثیتِ ملت تموّل کا یہ عالم ہے کہ پوری دنیا بالخصوص صنعتی دنیا کی معیشت کی رگِ جان اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا واضح ثبوت ہم ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد لگائی جانے والی (OIL EMBARGO) کے دوران ملاحظہ کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ مغرب کی معیشت کے جسد کے لئے خون کا کام وہ فاضل دولت سرانجام دیتی ہے جو یہ ملت وہاں کے بینکوں میں پھینک دیتی ہے۔

لیکن دولت کی اس قدر فراوانی اور ارزانی کے باوجود اس قلت کی حالتِ زار کس سے پوشیدہ ہے؟ قدرت کی طرف سے عطا کردہ اس قدر مادّی وسائل کے باوجود عالم یہ ہے کہ یہ ملت آج دنیا کی نظروں میں نکبت و افلاس، درماندگی و زبوں حالی، اور ذلت و پسماندگی کا ایک نشان بن کر رہ گئی ہے۔ آج اس ملت کی، جو غیرت و خودداری میں ہمیشہ ایک مثال تھی اور جو فخر سے کہا کرتی تھی ؎

مرا از شکستن چناں عار ناید

کہ از دیگراں خواستن مومیائی

یہ کیفیت ہے کہ اس نے جس دشمن کے خلاف جنگ لڑنی ہوتی ہے اُسی کے آگے کشکولِ گدائی لئے ہتھیاروں کے لئے دستِ سوال دراز کرتی ہے۔ اور پسماندگی کا یہ عالم ہے کہ اپنے قدموں کے نیچے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے زرِ سیّال کو سینۂ زمین سے باہر نکالنے کے لئے بھی یہ ملت غیروں کی محتاج ہے اور ان کو پکارتی ہے کہ آؤ اور یہ دولت ہمارے سینۂ زمین سے باہر نکال کر دو، خواہ اس کا نصف تم خود ہی کیوں نہ لے جاؤ۔ اس لئے کہ ہم ایسے نکالنے سے قاصر ہیں۔ اور تو اور حد یہ ہے کہ یہ ملت اپنی روٹی کے لئے بھی غیروں کی محتاج ہے اور قوتِ لایموت کے لئے بھی دوسروں کی دریوزہ گری کرتی ہے۔

جب میں نے تاریخ پر نگاہ ڈالی تو مجھے نظر آیا کہ بے سروسامان، مفلس اور نادار لوگوں کی ایک مٹھی بھر جماعت کہ جس کے پاس، سب سے پہلی جنگ میں پوری تلواریں بھی نہ تھیں، نے اُٹھ کر ایران و روما جیسی عظیم الشان سلطنتوں کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیا، اور ایک ایسا انقلاب برپا کیا کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ چند بے مایہ اور بے زر نفوس نے دنیا کی تاریخ کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔

جب میں نے دیکھا کہ ایک طرف یہ عالم کہ مفلسی، ناداری اور بے سروسامانی کے باوجود تسخیرِ عالم کے پروگرام تکمیل پا رہے ہیں اور دوسری طرف یہ کیفیت کہ گھر میں دولت کی نہریں بلکہ سمندر بہنے کے باوصف ذلت و پسماندگی اور نکبت و زبوں حالی مقدر بنی ہوئی ہے تو میری سمجھ میں آ گیا کہ ؎

زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

لیکن کافی سوچنے کے بعد بھی اور علامہ (ر) صاحب کے یہ فرمانے کے باوجود کہ "تو جس کو خود سمجھتا ہے" اس کے پہلے مصرعے کا مفہوم میری سمجھ میں نہ آ سکا۔ شاید اس کے "تو" کا مخاطب میں نہیں تھا۔ یعنی یہ کہ اگر بندۂ مومن کے زوال کا سبب بے زری نہیں تو پھر آخر کیا ہے؟ کہ بادی النظر میں تو "زر ہی" "قاضی الحاجات" ہے اور یہ بھی کہ علاوہ سرمایہ سے بچے ہوئے تمدن کو چلانا انسانی تمدن اور اس کے عروج و ارتقا کا سارا دار و مدار زر پہ

ہے۔ پھر اگر مومن کے زوال کا سبب بے زری نہیں تو کیا ہے؟

مجھے اس سوال نے کافی پریشان کیا اور میں نے اس سوال کو حل کرنے کے لئے اربابِ دانش و بینش کا رخ کیا۔ سب سے پہلے میں ایک اہلِ دانش کی خدمت میں حاضر ہوا جن کی اسلامی علوم پر مہارت کی کافی شہرت تھی اور اُن کی سفید ریش ان کے مذہبی تقدس اور دین میں اُن کے "تدبر و تفکر" کی غمازی کرتی تھی۔ میں نے جب اپنا سوال اُن کے سامنے رکھا تو انہوں نے ایک سرد آہ کھینچ کر کہا کہ افسوس ہے آجکل کے تعلیم یافتہ نوجوان ایسی باتوں کے مطالب سمجھنے سے قاصر ہیں۔ برخوردار! اصل میں قصور تمہارا نہیں بلکہ اس مغربی تعلیم کا ہے جس نے تمہیں بتایا ہی نہیں کہ مذہب کیا ہے۔ ہمارے زوال کا سبب صرف یہ ہے کہ ہم نے خدا کو بھلا رکھا ہے۔ آج مسجدیں ویران ہیں اور تماشا خانے آباد ہیں۔ ہم لوگ صوم و صلوٰۃ کی پابندیوں کو بہت بڑا بوجھ سمجھتے ہیں۔ ہمارا لباس، تراش خراش، بود و ماند سب غیرمسلموں کی نقالی ہے۔ ہم اپنے قومی لباس کی بجائے انگریزی لباس پہنتے ہیں۔ دسترخوان کی بجائے میز کرسیوں پر بیٹھ کر کھانا کھانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ غرض ہم ہر بات میں فرنگیوں کی تقلید کرتے ہیں۔ حالانکہ اسلام میں کھانا کھانے سے لے کر جوتا پہننے تک کے احکام موجود ہیں — لیکن ہم ان کو چھوڑ کر یہود و نصاریٰ کے طریقے اپناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم پر خدا کا غضب نازل ہو رہا ہے جس کی وجہ سے ہم پستی و ذلیل حالی میں مبتلا ہیں۔

میں جب اُن بزرگ کی یہ باتیں سن رہا تھا تو میرے ذہن میں چند دن پہلے اخبار میں پڑھی ہوئی ایک خبر گھوم رہی تھی۔ یہ حکومت کے قائم کردہ ادارے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش تھی جو اسلام کے عمیق مطالعہ اور قومی مسائل پر گہرے غور و فکر کے بعد مرتب کی گئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ اس قوم کی ہزار سالہ پستی و ذلیل حالی اور اسلام سے دور ہٹنے کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہاں کے شہروں میں بسنے والی پندرہ بیس فیصد آبادی کے بیشتر حصے نے کوٹ پتلون اور دیہات میں بسنے والی آبادی کی اکثریت نے تہبند باندھنا شروع کر دیا ہے۔ پس اس کا نہایت سہل اور تیر بہدف علاج یہ ہے کہ پوری قوم شلوار قمیض پہننا شروع کر دے چونکہ اسلامی لباس ہے۔ لہٰذا جب لباس "اسلامی" ہو جائے گا تو قوم خود بخود اسلامی ہو جائے گی۔ اور اس طرح اسلام کا احیاء ہو جائے گا۔ لیکن اُن بزرگ کے مذہبی تقدس کی عظمت اور اس ادارے کے نام کے جاہ و جلال سے مرعوبیت کے باوجود میرا ذہن اس بات کو قبول نہ کر سکا کہ شلوار قمیض پہن لینے سے اس کے اندر لپٹا ہوا ذہن اسلامی ہو جائے گا اور محض لباس کی تبدیلی سے اس قوم کے داخلی و خارجی احوال و کوائف میں تبدیلی آ جائے گی۔ لہٰذا میں نے نہایت ادب سے ان کی خدمت میں عرض کی کہ قبلہ نماز روزہ اور دیگر اسلامی شعائر کی اہمیت مسلم، لیکن ان شعائر کے ترک اور مسلمانوں کے قومی زوال میں مجھے کوئی منطقی ربط نظر نہیں آتا۔ اگر نماز روزہ اور دیگر اسلامی رسوم کا ترک ہی خدا کے غضب اور لہٰذا مسلمانوں کے زوال کا سبب ہے تو پھر یورپ اور امریکہ پر تو خدا کا غضب ہم سے کہیں زیادہ نازل ہونا چاہیئے کہ وہ لوگ ان چیزوں سے آشنا ہی نہیں ہیں۔ چلیئے ہو سکتا ہے آپ کہیں کہ یورپ اور امریکہ میں لوگ کسی نہ کسی شکل میں سہی اور کسی نہ کسی حد تک سہی خدا کو مانتے ہیں اور اس کی عبادت

بجا لاتے ہیں، لیکن روس اور چین تو سرے سے خدا کے وجود ہی کے منکر ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ دنیا کی دوسری اور تیسری بڑی طاقتیں ہیں، اُن پر خدا کا غضب کیوں نازل نہیں ہوتا۔ اور ایسا کیوں ہے کہ ؎

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

میری یہ باتیں سُن کر ان بزرگ کے چہرے کا رنگ متغیّر ہو گیا وہ جلال میں آ گئے اور کہنے لگے :۔

مغربی تعلیم نے تم لوگوں کے دماغ اس حد تک بگاڑ دیئے ہیں کہ یورپ، امریکہ اور روس کے سوا تمہارے دماغ میں کوئی چیز آتی ہی نہیں۔ برخوردار! یہ دنیا تو مردار ہے جس کے طالب کُتّے ہیں۔ یہ مومن کیلئے ایک قید خانہ ہے۔ مومن کا اصلی گھر تو قبر ہے۔ یہ دنیاوی جاہ و حشمت اور شان و شوکت اُس کیلئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ مومن کو تو اپنی عاقبت سنوارنے کی فکر کرنی چاہیئے۔ ہم لوگ بے شک اس دنیا میں عسرت و زبوں حالی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن آخرت کی تمام نعمتیں، اور خوشگواریاں ہمارے لئے ہیں۔

مَیں نے ان سے پوچھنا چاہا کہ اگر صورتِ حال یہ ہے تو پھر ترقی کا مفہوم آخر کیا ہے؟ لیکن اُنہوں نے جب متعدد روایات میرے سامنے اپنی بات کی تائید میں پیش کر دیں تو میری قوتِ گویائی سلب ہو گئی اور میں اپنے ذہن کی تمام خراشوں کو دبائے ہوئے وہاں سے رخصت ہوا۔

لیکن ان خراشوں نے مجھے چین نہ لینے دیا اور مَیں ایک اور دانش ور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ ایک ترقی پسند سکالر تھے اور اپنی جدتِ نظر کے لئے خاصے مشہور تھے۔ جب میں نے اپنی مشکل اُن کے سامنے رکھی تو انہوں نے فوراً فرمایا:۔

برخوردار! مسلمان کے زوال کا سب سے بڑا سبب اس کا مذہب ہے۔ جب تک مسلمان مذہب کے طوق کو اپنے گلے سے نہیں اُتار دیتا وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ مذہب ایک افیون ہے جو قوم کو سلائے رکھتا ہے۔ اب مذہب اور اخلاق کی ساری باتیں فرسودہ ہو چکی ہیں۔ اب (معاذ اللہ) رسولوں کے صحیفوں کا دَور گزر چکا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ ان سب بندھنوں سے آزاد ہو کر اپنے معاملات خود طے کرے۔ جب تک مسلمان مذہب سے پیچھا نہیں چھڑائے گا وہ کبھی ترقی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔

مَیں نے ان کی باتیں بھی سنیں اور وہاں سے چلا آیا۔ میرا ذہن پریشان ہو چکا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ایک ہی قوم کے دو دانشوروں نے میرے سوال کے دو بالکل متضاد جواب دیئے تھے۔ ایک کے نزدیک ترکِ مذہب تمام تر زوال و پسماندگی کا سبب تھا تو دوسرے کے نزدیک عین اس کا وجود۔ میں اسی کش مکش میں غلطاں و پیچاں تھا کہ میرے ذہن میں خیال آیا کہ جس حکیم الاُمت نے اس شعر میں اُمت کے زوال کے سبب کی طرف اشارہ کیا ہے کیوں نہ اس کے کلام کو مزید کھنگالوں۔ شاید مجھے اس میں اس کی مزید تفصیل مل جائے۔ لہٰذا میں نے ان کے کلام کی ورق گردانی کی، مجھے اُس میں یہ شعر ملا ؎

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اس سے مجھے معلوم ہوا کہ حکیم الامّت کے نزدیک اِس مّلت کے زوال کا سبب ترکِ قرآنِ کریم ہے۔ میں نے اس کتاب کی ورق گردانی شروع کی جو دیکھنے میں تو تقریباً چودہ سو سال پرانی ہے لیکن درحقیقت اس میں تمام احوال وکوائف تازہ ہیں۔ جب میں نے اس میں غور کیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی کتاب نہیں پڑھ رہا بلکہ ایک آئینہ دیکھ رہا ہوں جس میں مجھے اپنا، بحیثیتِ انسان، چہرہ نظر آ رہا ہے۔ جیسے یہ کتاب نہیں بلکہ کوئی زندہ ڈاکٹر ہے جو انسانیت کے تمام امراض کی تشخیص اور ان کا علاج بتا رہا ہے۔ جیسے یہ الفاظ و حروف میں لکھے ہوئے اوراق نہیں بلکہ ایک زندہ و پائندہ ہستی ہے جس کے ساتھ میں محوِ گفتگو ہوں۔ اور جو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتی ہے۔ لہٰذا میں نے اپنا سوال اس کتاب کی بارگاہ میں پیش کیا اور پوچھا ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!

تو ارشاد ہوا:۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ

تم قانونِ خداوندی کے ایک حصّے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔ (تم یہ سمجھتے ہو کہ اس دُنیا کی زندگی کو سنوارنے کے قوانین الگ ہیں اور آخرت کی زندگی کو سنوارنے کے الگ۔ لہٰذا تم زندگی کو مذہبی اور دُنیاوی اجزا میں تقسیم کرتے ہو۔) پس جو تم میں سے ایسا کرے اُس کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اس کے لئے دنیاوی زندگی بھی ذلت ورسوائی ہوگی اور قیامت کے دن وہ سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

میں اس جواب کو سُن کر کانپ اٹھا کیونکہ میں ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ چلئے اس دنیا کی چند روزہ زندگی ذلّت و مسکنت اور عسرت و درماندگی سے گزارنے کے بعد آخرت کی زندگی میں تو ہمارے لئے خوشگواریاں اور کامرانیاں ہوں گی۔ لیکن جب میں نے آخرت میں بھی شدید عذاب کی وعید سنی تو میں لرز اٹھا۔ میں نے پھر عرض کیا۔ کیا اس دُنیا میں اتنی عسرت و درماندگی اور ذلّت و بے چارگی کی زندگی گزارنے کے باوجود بھی آخرت میں ہمارے لئے کچھ نہ ہوگا۔ تو اس کا جواب یوں ارزانی ہوا۔

مَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ۔

جن کی آنکھیں اس دنیا میں نور سے محروم رہیں گی آخرت میں بھی ان کے لئے کوئی روشنی نہ ہوگی۔

پھر میں نے عرض کیا کہ غیر مسلم اقوام جو اس وقت عروج و ارتقاء کی انتہائی بلندیوں کو چھو رہے ہیں حالانکہ دین پر وہ بھی عمل پیرا نہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟ ارشاد ہوا:۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ

فِيۡهَا وَ هُمۡ فِيۡهَا لَا يُبۡخَسُوۡنَ ۝

جو دنیا کی زندگی اور زینت چاہتا ہے ہم ان کی جدوجہد کا پورا پورا ماحصل اسی دنیا میں دے دیتے ہیں۔ اس میں ان کے لئے کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ (اقوامِ مغرب نے خارجی کائنات کے متعلق قوانینِ فطرت کو اپنا کر تسخیرِ فطرت کے پروگرام پر عمل کیا لہٰذا انہیں اس دنیا کی کامرانیاں اور شادمانیاں حاصل ہو گئیں)۔

میں نے عرض کیا۔ کیا آخرت میں بھی وہ لوگ اسی طرح شادمان و کامران ہوں گے۔ تو جواب ملا:۔

فَمَا لَهٗ فِي الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ ۔

آخرت میں اُن کا کوئی حصّہ نہیں۔

میں نے عرض کیا کہ اب کیا شکل اختیار کی جائے کہ مسلمان اس ذلت و پسماندگی کی گہرائیوں سے نکل کر دنیا میں کامیابی اور کامرانی کی زندگی بسر کر سکیں اور آخرت میں بھی سرخروئی اور کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ ارشاد ہوا۔ لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۔ "اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود (سرچشمۂ قوانین) نہ ٹھیراؤ۔ زندگی میں دین و دنیا کی ثنویت ختم کرو۔ زندگی کی وحدت کو دنیا و آخرت کی حد بندیوں میں تقسیم نہ کرو۔ انسان کے خود ساختہ مذہب کو چھوڑ کر اللہ کا دیا ہوا دین اختیار کرو" میں نے عرض کیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ارشاد ہوا:۔

اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَكَانُوۡا يَتَّقُوۡنَ ۝ لَهُمُ الۡبُشۡرٰى فِي الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَفِي الۡاٰخِرَةِ ۝ لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ۝

جو لوگ زندگی کے صحیح نظریہ (جو قرآن نے پیش کیا ہے) پر یقین رکھتے ہیں اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔ اُن کے لئے حال کی زندگی اور مستقبل دونوں میں خوشگواریاں ہیں۔ یہ خدا کا ایسا محکم قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

اب حکیم الامتؒ کے اس شعر کا مطلب مجھ پر واضح ہو گیا ہے ؎

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں!

خدا کرے یہ بات پوری ملت کی سمجھ میں آ جائے۔ کاش ایسا ہو جائے!

۹۔ شوکت پرویز

صدرِ گرامی قدر و سامعین کرام

ہمارے مذاکرہ کا درحقیقت موضوع یہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب کیا ہیں اس موضوع پر ایک عرصہ سے تحقیق ہوتی چلی آ رہی ہے جس کے نتیجہ میں مقالات ہی نہیں لکھے گئے بڑی بڑی ضخیم کتابیں تصنیف

ہوتی ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں جو کچھ خود علامہ اقبالؒ نے کہا ہے وہ بڑا جامع ہے۔ چونکہ وہ کہا گیا ہے زبانِ شعر میں اس لئے وہ بڑا دلکش اور بڑا پُر تاثیر ہے۔ میری کوشش یہ ہے کہ جن اسباب کی نشاندہی حضرتِ علامہ نے کی ہے اِن میں سے چند ایک پیشِ خدمتِ سامعینِ کرام کروں۔ لیکن اس باب میں دشواری یہ ہے کہ اُن کا کلام بیشتر فارسی زبان میں ہے اور فارسی زبان اب ہمارے ہاں عجائب گھروں میں ممی شدہ لاشوں کے مانند رکھی جا چکی ہے۔ اندریں حالات مجھے اِن کے اُردو کلام پر انحصار کرنا پڑا ہے۔

انہوں نے اُمت کے زوال کا پہلا اور بنیادی سبب دینِ اسلام کا مذہبِ اسلام میں تبدیل ہو جانا بتایا ہے۔ یہ اصل ہے اور باقی تمام اسباب اس کی شاخیں۔ دین ایک نظام کا نام ہے جس کا پروگرام زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوتا ہے۔ اِس نظام نے اُمت کو انتہائی عروج عطا کیا۔ جب دین مذہب میں بدل گیا تو اِس کے پروگرام کی شکلیں تو باقی رہ گئیں روح ختم ہو گئی اور ظاہر ہے کہ کسی پروگرام کی بے روح شکلوں اور بے جان صورتوں کے ساتھ چپکے رہنے سے تو زندہ نتائج پیدا نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ حضرت علامہ بالِ جبریلؒ میں لکھتے ہیں :-

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے   وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج   یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

اور دوسری جگہ کہتے ہیں :-

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے   مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق   کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

اسی کتاب میں چند صفحات پہلے کہتے ہیں :-

دل ہے مسلماں تیرا نہ میرا   تو بھی نمازی میں بھی نمازی

لہٰذا :-

میں جانتا ہوں انجام اس کا   جس معرکے میں مُلّا ہوں غازی

اس سے بھی واضح تر الفاظ ہیں :-

تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور   ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر

اِسلام جب دین تھا تو اِس کا عملی نظام اقوامِ عالم کی مشکلات کا حل پیش کرتا تھا۔ اِس کی صلوٰۃ اس کے صیام۔ اس کا حج اِس کی زکوٰۃ انہی مشکلات کے حل کے مختلف اجزاء تھے جب وہ مذہب بن گیا، تو یہی اجزا رسوم بن کر رہ گئے اور ہمارے مذہبی پیشواؤں کا علم اس قسم کے مسائل تک محدود ہو گیا کہ نماز میں ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں یا نیچے یا سرے سے باندھنے ہی نہیں چاہئیں، آمین اونچی آواز سے کہنی چاہیئے یا آہستہ۔ انہی ائمہ کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ :-

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

انھوں نے بالِ جبرئیل کے ایک قطعہ میں دین اور مذہب کا تقابل ایسے انداز میں کیا ہے جسے وہ شوخ نہیں کہتے وہ بہت شوخ، فرماتے ہیں :۔

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں میری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدامست یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات !

اِس حقیقت کو وہ ارمغانِ حجاز میں ابلیس کے ایک مشیر کی زبان سے اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ :۔

ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

دین کے مذہب میں بدل جانے کے ساتھ وہ تصوف بھی مسلمانوں میں در آیا جو زندگی کی رگِ حیات کے لئے فالج تھا۔ چنانچہ حضرتِ علامہ بے روح شریعت اور بے جان طریقت دونوں کو زوالِ اُمت کا سبب قرار دیتے ہیں ۔ ان کے کلام میں صوفی و مُلّا پہ اس کثرت سے تنقید کی گئی ہے کہ اس سے ایک ضخیم تصنیف مرتب ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ ضربِ کلیم میں کہتے ہیں :۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست !
فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگِ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

اس سے اگلے صفحہ پر ہے :۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال مُلّا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار !
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

وہ ارمغانِ حجاز میں خطۂ کشمیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :۔

مُلّا کی نظر نورِ فراست سے ہے خالی بے سوز ہے میخانۂ صوفی کی مئے ناب

اے وادیٔ لولاب !

وہ کھلے کھلے الفاظ میں کہتے ہیں :۔

اِجز و ایماں اس زمانے کے لئے موزوں نہیں اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن
قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن !

مذہب پرستی اور تصوف کے ساتھ وہ ملوکیت کو بھی وجۂ زوالِ امت قرار دیتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب و تصوف اگر فالج پیدا کرتا ہے تو ملوکیت کا نتیجہ سرسام اور پاگل پن ہوتا ہے ۔ یہ بھی پیغامِ اقبالؒ کا اہم موضوع ہے اس کے متعلق ضمناً کچھ کہنا اس کا حق ادا نہیں کر سکے گا ۔ ملوکیت سے اُن کی مراد ان کی محض وراثتی حکمرانی نہیں ہے وہ ہر قسم کے استبداد اور استحصال کو ملوکیت سے تعبیر کرتے ہیں ۔ اِن کے الفاظ میں ۔ ع

ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

یہ ملوکیت رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں لے کر عوام کو اپنا محکوم اور محتاج بنا لیتی ہے۔ مذہب اور تصوف اس کے پنجۂ استبداد کی گرفت کو مستحکم رکھنے کے لئے لوگوں کو تھپکیاں دے دے کر سلاتے رہتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی مشہور نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں ابلیس کے ایک مشیر کی زبان سے کہلواتے ہیں کہ:۔

یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج　　صوفی و ملّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

یہ تینوں قوتیں مل کر ملّت کا گلا گھونٹ دیتی ہیں۔ اسی ملّتِ مظلوم کو وہ مخاطب کر کے کہتے ہیں:۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری　　اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری

وہ اِن اسباب کو سمیٹ کر ساقی نامہ میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:۔

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش　　مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش

تمدّن، تصوّف، شریعت، کلام　　بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی　　یہ اُمت روایات میں کھو گئی!

قدامت پرست طبقہ سے ہٹ کر جب وہ دورِ حاضرہ کی نئی نسل کی طرف آتے ہیں تو انہیں مغرب کی اندھی تقلید میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ انہی کے متعلق وہ سرد آہ بھر کر کہتے ہیں کہ:۔

ترا وجود سراپا تجلّیٔ افرنگ　　کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی　　فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

یوں تو حضرتِ علامہ کی کونسی تشبیہہ سحر آفریں اور کونسا استعارہ کیف آور نہیں ہوتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی برجستہ تشبیہہ کی مثالیں کم ملیں گی۔ عصرِ حاضر کے مغرب زدہ تصنّع اور ملمّع کے پیکروں کے کھوکھلے پن کو ایسا نیام کہنا جو ہو تو زرنگار لیکن اس کے اندر تلوار نہ ہو، حسنِ بلاغت کا کمال ہے۔ یہی وہ نوجوان ہیں جن کے متعلق وہ خوں فشاں آنکھوں سے کہتے ہیں کہ:۔

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی　　لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

اور انہی کو وہ یہ نصیحت کرتے ہیں کہ:۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر　　تو شاہیں ہے! بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

اِن خصوصی گوشوں سے آگے بڑھ کر عام معاشرے کی طرف آتے ہیں تو وہاں انہیں کوئی شے بھی اپنے صحیح مقام پر نظر نہیں آتی۔ طبقۂ امراء کی منافقانہ اسلام پسندی کو تو وہ ایک شعر میں بے نقاب کر کے رکھ دیتے ہیں جب کہتے ہیں کہ:۔

اے شیخ! امیروں کو مسجد سے نکلوا دے　　ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو

نام و نمود اور مفادِ خویش کی خاطر اسلام کے لئے ان کی خدمات بلحاظ خدا کے نزدیک کس قدر قابلِ نفرت ہیں۔ اس کے متعلق بالِ جبریلؔ میں فرمانِ خداوندی کے عنوان سے لکھتے ہیں:۔

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے　　میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

جہاں تک سیاست کا تعلق ہے اس کے لئے ان کا وہ ایک شعر ہی کافی ہے جو زبانِ زدِ خلائق ہے کہ:۔

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

دین کا نظام یہ تھا کہ ایک ضابطۂ خداوندی، ایک دین، ایک نظام، ایک اُمت، ایک مملکت، ایک مرکز۔ یہ تھا عقیدۂ توحید کا عملی مفہوم۔ مذہب میں ایک اُمت کی بجائے مختلف فرقے وجود میں آ گئے۔ ایک ضابطہ (قرآن مجید) کی جگہ مختلف فقہی احکام نے لے لی۔ ایک مملکت کی بجائے جغرافیائی حدود کے اندر گھڑی ہوئی مختلف سلطنتوں نے جنم لے لیا۔ یہی جغرافیائی حدود اور نسلی تفریق الگ الگ قومیتوں کا باعث بن گئیں۔ اس طرح امت کا شیرازہ بکھر گیا۔ وہ انہی اقوام کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ :۔

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

یہ ہیں ان اسباب کی چند ایک مثالیں جن کی وجہ سے علامہ اقبالؒ کے نزدیک ملتِ اسلامیہ پر زوال چھا گیا۔ لیکن یہ سوال پھر بھی جواب طلب رہ جاتا ہے کہ یہ اسباب پیدا کیوں ہوئے۔ ان کا سبب انہوں نے ایک لفظ میں بتا دیا جب کہا کہ :۔

دانش و دین و علم و فن بندگیٔ ہوس تمام
عشقِ گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

تحریکِ "طلوعِ اسلام" اسی عشقِ گرہ کشا کے فیض کو عام کرنے کی کوشش کا نام ہے۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن	**لاہور** میں ہر اتوار ۸ بجے صبح (فون ۸۰۰۰) ۲۵/بی، گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)
کمالیہ میں ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) (لائلپور) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بالمقابل چکی) اقبالؒ بازار۔	**لیّہ** میں ہر جمعہ بعد نمازِ مغرب کیپٹن غلام حیدر خاں کے مکان (محلہ ۲۵ وارڈ ۴) واقع عقبی گلی گرلز ہائی اسکول (بذریعہ ٹیپ)
ملتان میں ہر جمعہ بعد نمازِ مغرب (بذریعہ ٹیپ) (فون ۲۰۷۱) دفتر شاہ سنٹر۔ بیرون پاک گیٹ)	**کراچی** میں ہر اتوار ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام کمرہ ۲ ، ۹ محمدی مینشن بالمقابل میری ویدر ٹاور ایم اے جناح روڈ
گجرات میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ نیز بروز اتوار ۱۲ بجے شام بمقام ۱۲/۱/بی۔ بھمبر روڈ۔ (بذریعہ ٹیپ)	**لائلپور** میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) (فون ۲۴۹۳) ۶۵ کوتوال روڈ حیات سرجیکل کلینک۔
جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ (بذریعہ ٹیپ) (گجرات) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)	**کوئٹہ** میں ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) مکان نمبر ۱۹/۲۰ ۲ عبداللہ ستار روڈ (نزد گرین ہوٹل)

از پروفیسر فتح اللہ شہاب
(میانوالی)

جرمِ زنا کی سزا

قرآنِ حکیم کا انداز یہ ہے کہ اس نے چند احکام تو متعین طور پر دیئے ہیں اور زندگی کے دیگر معاملات کے متعلق اصول اور فروع عطا کئے ہیں۔ جس کتابِ عظیم کو تمام اقوامِ عالم اور تمام زمانوں کے لئے ضابطۂ زندگانی بننا تھا۔ اس کا یہی اسلوب ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن احکام ہوں یا اصول اس نے تکمیلِ دین کے اعلان کے ساتھ واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:-

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶)

تیرے رب کی تمام باتیں صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئیں اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

اس کے ساتھ اس کی بھی وضاحت کر دی کہ یہ کتاب انسانی رہنمائی کے لئے کافی ہے اس لئے اس میں کسی اضافہ کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سورۂ عنکبوت میں ہے:-

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (۲۹/۵۱)

کیا یہ اُن کیلئے کافی نہیں کہ خدا نے تیری طرف یہ کتاب نازل کر دی جو ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔

۲- قرآنِ مجید میں جو احکام متعین طور پر دیئے گئے ہیں ان میں چار جرائم کی سزائیں بھی شامل ہیں۔ فقہ کی اصطلاح میں ان سزاؤں کو حدود کہا جاتا ہے۔ وہ جرائم ہیں، زنا (جس میں ناحق تہمت تراشی بھی شامل ہے۔) سرقہ، قتل اور بغاوت۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر ان میں سے زنا کی سزا ہے۔ اس کے متعلق قرآنِ مجید میں واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ:-

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۠ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَاۗىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (سورۃ النور ۲)

(ترجمہ) زانی مرد اور زانیہ عورت میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے لگاؤ۔ اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو قانونِ خداوندی کے نفاذ میں کسی قسم کی نرمی مت برتو۔ اور یہ سزا اس طرح دو کہ مومنین کی ایک جماعت وہاں موجود ہو۔

قرآنِ مجید میں یہی ایک مقام ہے جہاں زنا کی سزا کا ذکر ہے۔ چونکہ یہ حکم متعین طور پر دیا گیا ہے اس لئے کسی

دوسرے مقام پر اس کی مزید وضاحت کی ضرورت لاحق نہ ہوئی۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا تھا کہ قرآن تمہارے لئے کافی ہے۔ جب تک صدرِ اوّل میں قرآنی نظام نافذ رہا۔ حسبنا کتاب اللہ، مملکت اسلامیہ کا دستور رہا، لیکن جب وہ نظام باقی نہ رہا تو پھر یہ تصوّر پیدا کیا گیا کہ انسانی رہنمائی کے لئے قرآن کافی نہیں ہے۔ اس میں حکمتؐ و اضافہ کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں زنا کی سزا کے متعلق کہا گیا کہ قرآن میں متعین کردہ سزا غیر شادی شدہ کے لئے ہے۔ شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزا رجم یعنی سنگسار کرنا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر اُمت میں یہ خیال اُبھرا ہوگا کہ ایسا اہم حکم خود قرآن کریم میں کیوں نہ دیا گیا یہ تو قرآن پر اضافہ ہے۔ اب بجائے اس کے کہ اس کا اعتراف کیا جاتا کہ یہ واقعی قرآن پر اضافہ ہے۔ کہا یہ گیا کہ نہیں یہ حکم خود قرآن میں موجود تھا لیکن جو قرآن اُمت کے پاس موجود ہے اس میں یہ آیت نہیں رہی۔ یہ ایسا "عذرِ گناہ" تھا جس پر زمین لرز جاتی، آسمان پھٹ پڑتا۔ لیکن یہ عقیدہ پیدا کرنے والوں کے دلوں میں اس سے معمولی سی لرزش بھی نہ پیدا ہوئی اور انہوں نے اس کی تائید میں روایات وضع کر لیں۔ چنانچہ حضرت ابی بن کعبؓ سے یہ روایت بیان کی گئی:۔

عن زر بن جیش، قال قال لی ابی بن کعب کاین تعد سورۃ الاحزاب قلت اثنین و سبعین آیۃ او ثلاثۃ و سبعین آیۃ۔ قال ان کانت لتعدل سورۃ البقرۃ۔ کنّا لنقرأ فیھا آیۃ الرجم قلت وما ایۃ الرّجم۔؟ قال اذا زنیا الشیخ والشیخۃ فارجموھما البتۃ۔ نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم۔

(الاتقان فی علوم القرآن۔ جلد دوم صفحہ ۲۵)

(ترجمہ) حضرت زر بن حبیش سے روایت ہے کہ مجھ سے حضرت ابی بن کعب نے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ سورۃ احزاب میں کتنی آیات تھیں؟ میں نے کہا کہ یہی ۷۲ - ۷۳ (جو سورۃ احزاب میں موجود ہیں) انہوں نے کہا کہ نہیں بلکہ سورۃ احزاب میں سورۃ بقرہ جتنی آیات تھیں۔ (یعنی ۲۸۶ ناقل)۔ ان میں ایک آیہ رجم بھی تھی جس کی ہم تلاوت کیا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آیت رجم کیا تھی، فرمایا کہ "جب بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت زنا کے مرتکب ہوں تو انہیں سنگسار کر کے ختم کر دیا جائے۔ یہ اس اللہ کی طرف سے سزا مقرر ہے جو غلبہ اور حکمت والا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھئے کہ اس روایت میں الفاظ الشیخُ وَالشیخۃُ آئے ہیں۔ عربی زبان کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ ان کے معنی ہیں بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت۔ لیکن ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ ان سے مراد ہیں شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت۔ عربی زبان میں یہ الفاظ ان معانی میں کہیں نہیں آئے۔ لیکن ان واضعین روایت کے ذہن میں زانیوں کو دو قسموں میں منقسم کرنا تھا۔ اس لئے سورۃ النور

کی آیت ہیں جو الفاظ ــــ الزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ آئے ہیں۔ ان کے معنی کئے گئے "غیر شادی شدہ عورت اور غیر شادی شدہ مرد" اور اس کے بالمقابل الشیخ و الشیخۃ کے معنی کئے گئے "شادی شدہ مرد، اور شادی شدہ عورت"۔

اس روایت میں ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ سورۃ احزاب میں سورۃ البقرہ جتنی آیات تھیں۔ یعنی ۲۸۶ آیات۔ قرآن مجید میں سورۃ احزاب کی کل آیات ۷۳ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ بقایا ۲۱۳ آیات کا کیا ہوا؟ ــــ وہ کہاں چلی گئیں۔ ان میں سے ایک آیت کے متعلق جو رجم سے متعلق تھی انہوں نے تحقیق کر لی۔ غور سے سنیئے کہ وہ تحقیق کیا تھی۔ سنن ابن ماجہ میں (جو صحاح ستہ کی ایک مستند کتاب ہے)۔ کہا گیا ہے کہ جب قرآنِ کریم کو مرتب کیا جانے لگا تو صحابہ کرام رضؓ کو دو آیتیں کہیں نہ مل سکیں۔ ایک آیت رجم سے متعلق تھی، اور دوسری رضاعت سے متعلق۔ چنانچہ وہ ان آیات کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے حضرت عائشہ رضؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو انہوں نے فرمایا کہ:۔

آیہ رجم اور آیہ رضاعتِ کبیر ایک صحیفہ میں تھیں جو میرے تخت کے نیچے تھا۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ہم لوگ اس حادثہ میں مشغول ہو گئے۔ اتنے میں گھر کی پالتو بکری اندر گھس گئی اور اس صحیفہ کو کھا گئی۔

لہٰذا ان دونوں آیات کا دنیا میں وجود ہی باقی نہ رہا۔ لیکن اس کے باوجود صحابہ رضؓ کو اس پر اصرار تھا کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں ہم آیہ رجم کی تلاوت کیا کرتے تھے اور ایسا کہنے والوں میں حضرت عمر رضؓ بھی موجود تھے۔ لوگوں نے آپ سے کہا۔ (غالباً اس زمانہ میں جب وہ بر سرِ اقتدار آئے) کہ جب آپ خود کہتے ہیں کہ آپ بھی اس کی آیت رسول اللہؐ کے زمانے میں تلاوت کیا کرتے تھے۔ تو آپ اسے قرآنِ حکیم میں درج کیوں نہیں کر دیتے۔ آپ کا جواب ملاحظہ فرمایئے:۔

وقال عمر رضؓ لولا ان یقول الناس زاد ھم فی کتاب اللہ لاثبتہ فی المصحف۔ (تفسیر کبیر۔ از امام رازی۔ نیا ایڈیشن۔ جلد ۳۲ صفحہ ۱۳۴)

(ترجمہ) حضرت عمر رضؓ نے فرمایا کہ میں اس آیت کو قرآن میں ضرور درج کر دیتا۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ لوگ کہیں گے کہ عمر رضؓ نے خواہ مخواہ قرآنِ کریم میں اضافہ کر دیا۔

اس پر سوال پیدا ہوا کہ پھر خدا کے اس حکم کی تعمیل کیسے ہو۔ آپ نے فرمایا کہ ہم اس آیت کو قرآن میں تو درج نہیں کریں گے لیکن تعمیل اس کی کرتے رہیں گے۔ چنانچہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ موجود ہے کہ:۔

(۱) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآنِ حکیم میں موجود تو ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ وہ صرف تلاوت کے لئے رہ گئی ہیں۔ اور

(۲) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن میں تو موجود نہیں۔ لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ جیسے آیہ رجم۔

آپ نے غور فرما لیا کہ رجم (سنگساری) کا حکم کس طرح قرآن مجید سے ثابت کیا گیا؟ اس پر تو آپ غور کریں یا نہ کریں لیکن اس پر تو ضرور غور کیجئے گا کہ اس کے بعد خود خدا کی کتاب کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ اور آپ یہ سن کر حیران

ہوں گے کہ اہلِ حدیث ہوں یا اہلِ فقہ قرآنِ مجید کی اس حیثیت پر سب متفق ہیں۔

یہ تو رہا رجم کا حکم۔ اس کے بعد اس کی حکمت بھی بیان کی گئی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ ایسا کرنا عین مطابقِ فطرت ہے۔ ہمارے ہاں احادیث کے چھ مجموعوں کو صحیح قرار دیا جاتا ہے اور ان میں بخاریؒ کا مجموعہ سرِفہرست ہے ــــ اس موضوع پر بخاریؒ کی دو ایک روایات ملاحظہ فرمائیے :۔

عن عمرو بن میمون قال رأیت فی الجاھلیۃ قردۃ اجتمع علیہا قرود قد زنت فرجموھا فرجمت معہم۔

(صحیح بخاری باب ایام الجاہلیۃ)

(ترجمہ) حضرت عمرو بن میمون سے روایت ہے۔ (جو ایک صحابی ہیں) کہ زمانۂ جاہلیت میں، میں نے ایک بندریا کو دیکھا جس نے زنا کا ارتکاب کیا۔ سب بندر اس کے گرد جمع ہوگئے اور اسے سنگسار کیا اور میں نے بھی ان کے ساتھ پتھر مارے۔

اس روایت میں تو اس واقعہ کو اجمالاً بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل صحیح بخاریؒ کے شارح امام ابن حجر عسقلانی نے اس طرح بیان فرمائی ہے :۔

عن عمرو بن میمون قال کنت فی الیمن فی غنم لاھلی وانا علی شرف۔ فجاء قرد مع قردۃ۔ فتوسد یدھا۔ فجاء قرد اصغر منہ۔ فغمزھا۔ فسلت یدھا من راس القرد سلا رفیقا۔ فتبعتہ۔ فوقع علیہ وانا انظر ثم رجعت وجعلت تدخل یدھا تحت قرد اول برفق۔ فاستیقظ فزعا۔ فشمھا۔ فصاح فاجتمعت القرود فجعل یصیح ویومی الیہا بیدہ۔ فذھب القرود یمنۃ ویسرۃ فجاؤا بذلک القرد اعرفہ۔ فحفروا لہا حفرۃ فرجموھا۔

(فتح الباری شرح صحیح بخاری از ابن حجر عسقلانی۔ جلد ہفتم صفحہ ۱۲۱)

(ترجمہ) حضرت عمرو بن میمون فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ یمن میں اپنے اہل کی بکریاں چرا رہا تھا اور میں ایک اونچی جگہ پر کھڑا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بندر، بندریا کو ساتھ لئے ہوئے آیا اور اس کے ہاتھ کو اپنے سر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ اس کے بعد (پہلے بندر کے مقابلے میں) نسبتاً کم عمر کا بندر آیا۔ اس نے بندریا کو آنکھ ماری۔ تو اس نے آہستہ سے بندر کے سر کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اس (نوجوان) بندر کے پیچھے چل پڑی۔ اس بندر نے اس کے ساتھ مباشرت کی جسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر وہ لوٹی اور

ؔ حیوانات کے متعلق زنا کا تصور پیش کرنا، ان وضعی روایات ہی کا حصّہ ہے!

پہلے بندر کے سر کے نیچے آہستہ سے اپنا ہاتھ دینے لگی۔ لیکن وہ گھبرا کر جاگ اٹھا۔ اس نے (محسوس کیا کہ دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے) چنانچہ اس نے بندریا کو سونگھا تو سارا معاملہ سمجھ میں آگیا۔ اس نے دھائی مچانا شروع کر دی۔ اس پر بہت سے بندر جمع ہو گئے۔ وہ بندریا کی طرف انگلی بڑھا بڑھا کر چیختا رہا۔ چنانچہ وہ بندر ادھر، ادھر دوڑے اور اس (مجرم) بندر کو پکڑ لائے۔ جسے میں پہچانتا تھا۔ انہوں نے ان دونوں کے لئے گڑھا کھودا اور پھر انہیں اس میں سنگسار کر دیا۔ (جیسا کہ اصل روایت میں کہا گیا ہے خود حضرت عمرو بن میمون نے بھی انہیں کچھ پتھر مارے تھے۔)

یہ ہے اس سزا کی تائید میں فطرت کی گواہی، جسے ان روایات کی رو سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

کہا یہ جاتا ہے کہ کسی زانی یا زانیہ کو رجم کی سزا دیجئے اور پھر دیکھئے کہ معاشرہ سے زنا جیسا فعل شنیع کس طرح ختم نہیں ہوتا۔ یہ تو ہم کہہ نہیں سکتے کہ اس سے اس جرم کا ارتکاب ختم ہو جائیگا یا نہیں قرآن کریم میں جرم قتل کی سزا موت مقرر کی گئی ہے۔ اور یہی سزا ہمارے مروجہ قانون کی رو سے بھی قاتل کو دی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود قتل کی وارداتوں کا ختم ہو جانا تو ایک طرف ان میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ محض سزا دینے سے جرم رُک نہیں جاتا۔ جرائم کے سدباب کے لئے افراد کے قلب و نگاہ کی تطہیر اور معاشرے کے اجتماعی نظام کی اصلاح ضروری ہوتی ہے۔ بہرحال یہ ایک الگ موضوع ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ کہا یہ جاتا ہے کہ زنا کی یہ سزا دی جائے تو اس جرم کا سدباب ہو جائے گا۔ لیکن جرم کی سزا تو اُسی صورت میں مل سکے گی جب جرم ثابت ہو جائے۔ ہماری فقہ نے اس جرم کے اسباب کے لئے ایسی شرائط عائد کی ہیں، جن کی رو سے اس جرم کا ثابت ہونا ناممکنات میں سے ہے مثلاً فقہ حنفی کی معتبر ترین کتاب ہدایہ شریف میں ہے:-

(۱)۔ من زنی فی دار الحرب او فی دار البغی ثم خرج الینا لا یقام علیه الحد۔

(ہدایہ اوّلین مجیدی۔ صفحہ ۴۹۳)

(ترجمہ) جس نے دارالحرب یا باغیوں کے علاقے میں جرم زنا کا ارتکاب کیا اور پھر دارالاسلام میں آگیا، تو اس پر کوئی حد نہیں۔

وضاحت کے لئے بطور مثال یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص واہگہ بارڈر کے کھیت میں زناکاری کے بعد پھر اپنی طرف آجائے تو اسے اس جرم کی کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ اب آگے چلئے:-

(۲) ومن اقر اربع مرات فی مجالس مختلفة انه زنی بفلانة وقالت هی تزوجتنی۔ او اذا اقرت بالزناء وقال الرجل تزوجها فلا حد علیها وعلیه المهر۔ (ایضاً)

(ترجمہ) اگر کوئی شخص (کسی ایک جگہ نہیں) چار مختلف مجالس میں (اور ایک بار ہی نہیں) چار دفعہ اقرار کرے

کہ اُس نے فلاں عورت سے زنا کیا ہے لیکن عورت کہے کہ نہیں اس نے مجھ سے (پہلے) نکاح کر لیا تھا یا اسی طرح کوئی عورت ارتکابِ زنا کا اقرار کرے لیکن مرد کہے کہ نہیں میں نے اس سے نکاح کر لیا تھا، تو نہ اس مرد کو سزا دی جائے گی اور نہ اس عورت کو۔ البتہ اس مرد کے لئے ضروری ہوگا کہ اس عورت کو مہر کے پیسے ادا کر دے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ بات کہاں تک پہنچ رہی ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ زنا جیسے جرم کے ارتکاب کا کوئی سدِّباب سوچا گیا ہے بلکہ اس کے لئے پھاٹک کھول دیئے گئے ہیں۔ وہ کون مرد اور عورت ہے جو باہمی رضامندی سے زنا کا ارتکاب کریں اور اس طرح اس کی سزا سے بچ نہ جائیں۔

اور اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ اگر یہ زناکار خود اس جرم کے ارتکاب کا اعتراف نہ کریں تو پھر عدالت کے لئے ضروری ہوگا کہ یہ تحقیق کرے کہ اس جرم کا ارتکاب ہوا تھا یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات شہادات (گواہیوں) کی رو سے ہی طے ہو سکے گی۔ اب آپ یہ دیکھئے کہ اس شہادت کے لئے کیا کیا شرائط عائد کی گئی ہیں ——— امام ابنِ رشد فرماتے ہیں:-

وان من وصفهم ان يكون عدلا وان من شرط هذه الشهادة ان تكون المعاينة فرجه في فرجها وانها تكون بالتصريح لا بالكناية

(بدایۃ المجتہد۔ جلد دوم مطبوعہ مصر۔ صفحہ ۴۳۰)

(ترجمہ) پہلی شرط یہ ہے کہ وہ گواہ عدل کی صفت سے متصف ہوں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اس واقعہ کے عینی شاہد ہوں۔ یعنی انہوں نے بچشمِ خود اس فعل کو صادر ہوتے دیکھا ہو۔ اور اس کے بعد اسے اشاروں کنایوں سے بیان نہ کریں بلکہ پوری صراحت سے بیان کریں۔[حا]

آپ سوچئے کہ کیا کوئی مرد اور عورت اس فعل کے مرتکب ایسی صورت میں ہو سکتے ہیں کہ ایک نہیں چار چار شخص اس کی ساری جزئیات تک کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ حیوانات کے جنسی اختلاط ہیں تو یہ چیز ممکن ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ انسانوں کی بے حیا سے بے حیا تک کوئی قوم یا گروہ ایسا نہیں ملے گا جو ناجائز تو ایک طرف اس جائز عمل کا ارتکاب بھی اس بے حیائی کے ساتھ کرے۔ فرمائیے! کیا اس جرم کے اثبات کے لئے اس قسم کے چار گواہ مل سکیں گے؟

اور اگر بفرضِ محال ایسے چار گواہ مل بھی جائیں، لیکن ان کی گواہی کی جزئیات میں کسی قسم کا اختلاف پایا جائے۔ حتیٰ کہ اگر دو گواہ زنا بالجبر کی شہادت دیں اور دو گواہ یہ کہہ دیں کہ نہیں اس عورت نے اس مرد کو اپنی طرف مائل کیا تھا تو اس صورت میں بھی یہ جرم ثابت نہیں ہو سکے گا۔ ہدایہ میں یہ تمام تفاصیل موجود ہیں۔

[حا] حیا مانع ہے کہ ہم ان الفاظ کا اُردو ترجمہ پیش کریں۔ امام ابنِ رشد نے تو پھر بھی قدرے محتاط انداز میں بات کی ہے۔ دیگر فقہاء نے اس کی جزئیات تک کو جس صراحت سے بیان کیا ہے، ان کے ترجمے سے ان صفحات کو ملوث کرنے کی تو ہم جرأت نہیں کر سکتے!

ہماری فقہ کی کتابوں میں جنسیات کے متعلق اس کثرت اور تفصیل کے ساتھ "مسائل" درج ہوتے ہیں کہ کوئی سلیم الطبع انسان انہیں پڑھ بھی نہیں سکتا۔ اور یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان طالب علموں کو جو نوجوان بھی ہوتے ہیں اور (بالعموم) غیر شادی شدہ بھی۔ جن مقامات میں لونڈیوں کا ذکر آتا ہے وہاں یہ تفاصیل فحاشی کی ہر حد کو پھاند جاتی ہیں۔ ہم اپنے دل پر جبر کر کے یہاں دو ایک مثالیں پیش کریں گے۔ ہدایہ اولین صفحہ ۴۸۹ پر لکھا ہے کہ "اگر کوئی "من چلا" اپنے بیٹے یا پوتے کی لونڈی سے زنا کا ارتکاب کرے اور یہ بھی کہے کہ اسے اس کا علم تھا کہ ایسا کرنا شرعاً حرام ہے۔ اس کے باوجود اسے کوئی سزا نہیں دی جائے گی"۔ دوسری مثال تو خود ہدایہ ہی کے الفاظ ہی میں ملاحظہ فرمائیے:۔

ومن وطی اجنبیۃ فیما دون الفرج یعزر۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۹۰)

(ترجمہ) اگر کوئی شخص کسی ایسی عورت کے ساتھ جس کے ساتھ وہ کوئی واقفیت نہیں رکھتا۔ شرمگاہ کے علاوہ کہیں اور اختلاط کرے تو اسے جرمِ زنا کی سزا تو نہیں دی جائے گی البتہ کوئی اور چھوٹی موٹی سزا دی جا سکتی ہے۔

پھر حیا مانع ہے ورنہ ہم بتاتے کہ "کسی دوسری جگہ اختلاط" کی تفاصیل میں ہماری کتبِ فقہ میں کیا کیا کچھ کہا گیا ہے۔ اور ہمارے بڑے بڑے ائمہ نے ناواقف عورت تو ایک طرف خود اپنی بیوی کے سلسلے میں کیا کیا گل کھلائے ہیں۔ تفصیل کے لئے حافظ ابن حجر عسقلانی کی شرح بخاری (فتح الباری) کے علاوہ علامہ عینی کی شرح (عمدۃ القاری) میں دیکھئے کہ اس باب میں اور تو اور امام مالکؒ تک کا کیا مسلک بیان کیا گیا ہے۔ (یہ بحث ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث" میں دی گئی ہے۔)

یہ ہے رجم کی سزا کے متعلق اس حکم کا اجمالی سا تعارف جسے نافذ کرنے سے، کہا جاتا ہے کہ مملکت اسلامی بن جائیگی۔ اگر فرصت ملی تو میں سرقہ، اور خمر (شراب) کی سزاؤں کے متعلق بھی اسی قسم کی تفاصیل پیش کروں گا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں نے اس باب میں اپنی طرف سے ایک لفظ تک نہیں لکھا۔ ہر لفظ مستند کتبِ احادیث اور کتبِ فقہ کے حوالوں سے لکھی گئی ہے۔

یہ ہیں چند ایک مثالیں ان احکام کی جنہیں "احکامِ شریعت" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

ضروری اعلان

(۱) جواب طلب امور کے لئے جوابی خط بھیجئے ورنہ تعمیل نہیں ہوگی۔

(۲) ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک پرچہ نہ ملنے کی شکایت پر پرچہ بلا قیمت بھیجا جائے گا۔ اس کے بعد قیمتاً بھیجا جائے گا۔

(۳) خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

(ناظمِ ادارہ)

شہرۂ آفاق کتابیں جن سے صحیح اسلام سمجھ میں آسکتا ہے!

۱۔ من و یزداں

خدا پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ قرآن، دیگر اہلِ مذاہب کے خدا پر ایمان کو ایمان کیوں تسلیم نہیں کرتا۔ قرآن، خدا کا کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس خدا کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے۔

قیمت مجلد۔ پچیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

۲۔ ابلیس و آدم

پہلا انسان کس طرح وجود میں آیا۔ قصۂ آدم کا مفہوم کیا ہے۔ ابلیس و آدم کی کشمکش، شیطان، ملائکہ، جنات، وحی، نبوت، رسالت جیسے اہم بنیادی نظریات کا صحیح تصور، علومِ حاضرہ کی روشنی میں۔

قیمت مجلد پچیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

۳۔ جوئے نور

حضرات انبیاء کرام؈ اور اقوامِ سابقہ کی سرگذشتیں، آسمانی انقلاب کے خلاف مفاد پرست گروہوں کا ملی تحریکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داروں کی تباہ کاریاں۔

(حضرت نوح؈ سے حضرت شعیب؈ تک)

قیمت مجلد۔ پچیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

۴۔ برقِ طور

صاحبِ ضربِ کلیم؈ اور فرعونیت کی آویزش۔ داستانِ بنی اسرائیل۔ قوموں کے عروج و زوال کے ابدی اصول۔ شوکتِ سلیمانی؈ اور سطوتِ داؤدی۔ یہودی ذہنیت اور اس کا انجام۔ کیا یہودیوں کی مملکت کبھی قائم نہیں ہو سکتی؟ ارضِ مقدس کی داستان۔

قیمت مجلد۔ پچیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

۵۔ شعلۂ مستور

حضرت مریم؈ اور حضرت عیسیٰ؈ کے کوائفِ حیات۔ کیا حضرت عیسیٰ؈ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا وہ زندہ آسمان پر تشریف فرما ہیں۔ کیا وہ پھر سے زمین پر اتریں گے؟ واقعۂ تصلیب کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن کریم اور عصرِ حاضر کے محققین کے نزدیک بصیرت افروز حقائق۔ حقیقت کشا معلومات۔ قیمت پچیس روپے

(علاوہ محصولڈاک)

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار عظیم جلدوں کی یہ قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ چار جلدیں

قیمت فی جلد۔ پچیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

ملنے کا پتہ

ادارۂ طلوع اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور